سلسلۂ دار المصنفین

نمبر ۱۳۲

میرزا مظہر جانجاناں

اور

اُن کا کلام

اس میں میرزا مظہر جانجاناں کے حالات و کمالات کے ساتھ اُن کی تمام تصانیف کا تعارف، اور اُن کے فارسی اور اُردو کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے

از

جناب عبدالرزاق قریشی مرحوم

در مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ طبع گردید

۱۹۷۹ء

کاتب اقبال احمد

۷۸۶

فہرست مضامین

میرزا مظہر جانجاناں اور اُن کا کلام

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پیش لفظ	۱ - ۳	ارشاد و ہدایت	۴۵
(سید صباح الدین عبدالرحمن)		شعر و شاعری	۵۷
عبدالرزاق قریشی مرحوم	۴ - ۱۲	تلمذ	۵۹
(جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی)		تخلص	۶۰
مقدمہ	۱ - ۲۱	شہادت	۶۶
حالات زندگی		سال وفات	۶۸
۲۲ - ۱۴۷		مزار کی تعمیر	۷۲
نام و نسب	۲۲	کتبہ	۷۳
میرزا جان	۲۷	میرزا صاحب کا قاتل	۷۵
میرزا جانجاناں	۳۰	میرزا صاحب کی شہادت ایک	۷۹
ولادت	؍؍	سیاسی واقعہ	
وطن	۳۴	اعزہ و متعلقین	۸۰
تعلیم و تربیت	۳۵	شاہانہ زندگی	۸۱
تربیت باطنی	۳۹	خلفاء	۸۶

مضمون	صفحہ
قاضی ثناء اللہ پانی پتی	۸۷
شاہ غلام علی	۸۹
مولوی نعیم اللہ بہرائچی	۹۱
مولوی غلام یحییٰ	۹۳
تلامذہ	۹۴
انعام اللہ خاں یقین	۹۵
خواجہ حسن اللہ بیان	۹۷
میر محمد باقر حزیں	۹۸
ہیبت قلی خاں حسرت	۹۹
محمد فقیہ دردمند	۱۰۰
اخلاق و عادات	۱۰۲
ملفوظات	۱۳۶
بزرگوں اور ہم عصروں کی نظر میں	۱۴۴
تصانیف	
۱۴۸ - ۱۵۰	
(الف) نظم	
فارسی کلام	۱۵۱-۱۷۹
اردو کلام	۱۸۰-۲۰۹
کلام پر تبصرہ	۱۹۲
خریطۂ جواہر	۲۱۰-۲۱۷
(ب) نثر	۲۱۸
(۱) مکاتیب	۲۱۸-۲۴۳
(۲) بعض دوسری نثری تحریریں	۲۴۴-۲۴۶
خاتمۂ سخن	۲۴۷
باقیات مظہر	۲۵۱-۲۷۲
کتابیات	۲۷۳

۷۸۶

پیش لفظ

یہ سطریں لکھی جارہی ہیں تو اس کتاب کے لائق مرتب جناب عبدالرزاق قریشی مرحوم دبلے پتلے بظاہر تمام تکلفات سے عاری انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے کتب خانہ کے ایک گوشہ میں ایک میز پر بیٹھے نظر آرہے ہیں، ان سے یہاں جب کبھی ملنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوتا کہ محبت اور اخلاص کا ایک مجموعہ سامنے ہے، وہ اس حیثیت سے ایک قابل قدر نمونہ تھے کہ انھوں نے عربی مدرسہ اور نہ کسی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم پائی، مگر ان کی گفتگو اور تحریر سے ان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا اثر پڑتا، ان کا علمی و ادبی ذوق بالکل وہبی تھا قدرت کی طرف سے ان کو جو یہ عطیہ ملا تھا، اس کی قدر کر کے انھوں نے اس کا پورا مصرف لیا، ان سے لگاؤ اس لئے بھی پیدا ہوا کہ ان کی تحریر کا ظاہری و معنوی رنگ وہی تھا' جو دارالمصنفین کے ارباب قلم کا ہے، ان کو علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ان کے شاگردوں سے بڑی محبت تھی، اس لئے وہ ان کی تحریروں کے اسلوب سے بھی متاثر رہے، ان سے ملتا تو کہتا کہ ان کی جو اصل جگہ ہے، وہاں کے لوگ ان کے لئے چشم براہ ہیں، وہ اپنی خاکساری میں کہتے کہ وہ جگہ ان کے لیے بہت اونچی ہے، اپنی آخر زندگی میں دارالمصنفین آنے کے لیے تیار ہو گئے تھے، بمبئی سے اپنے وطن اعظم گڈھ کے گاؤں بسہم آئے تو اپنی پرانی وضعداری میں ہم لوگوں سے بھی آکر ملے، ان کو وہ کمرہ بھی دکھایا گیا، جو ان کو اپنی آغوش میں لینے کیلئے منتظر تھا، یہ طے ہو گیا کہ ابھی تو وہ حج کرنے کی سعادت حاصل کریں گے، پھر بقیہ زندگی

دارالمصنفین ہی میں آکر گذاریں گے، مگر چند روز کے بعد ہی خبر ملی کہ ۳۰ جولائی ۱۹۷۰ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، بڑا دکھ ہوا کہ دارالمصنفین کی علمی مجلس میں ایک بہت اچھے اور مخلص اہل قلم کا اضافہ ہونے والا تھا کہ مشیت ایزدی سے وہ اس سے ہمکنار ہونے کے بجائے رحمت الٰہی کی آغوش میں چلے گئے،

وہ انجمن اسلام بمبئی کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بڑی تنخواہ نہیں پاتے تھے، پوری زندگی تجرد میں گذاری، زندگی بہت سادہ بسر کرتے تھے، اپنی ضروریات پوری کر کے اپنی تنخواہ سے عزیزوں، دوستوں اور طالب علموں کی بھی مدد کیا کرتے تھے، یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ دارالمصنفین کے لئے بھی چھ ہزار کی رقم پس انداز کر رکھی تھی، جو ان کی وفات کے بعد اس کو باضابطہ طور پر ملی، اپنی دو تصانیف کے مسودے بھی اس کے لئے چھوڑ گئے، ایک تو یہی زیر نظر کتاب ہے، جو اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، اور دوسرے کا عنوان "اردو زبان کی تمدنی اہمیت" ہے، اول الذکر کا پہلا اڈیشن انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی سے شایع ہوا تھا، جس سے علمی حلقے میں ان کی تحریر کی قوت اور تحقیق کی بصیرت کا بڑا اچھا اثر پڑا، اسی کے ساتھ مرزا مظہر جانجاناں کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آئے جو اس سے پہلے نہ آسکے تھے، اس کا پہلا اڈیشن ختم ہوا تو اس میں انھوں نے بہت کچھ ترمیم و اضافہ کیا، ان کی خواہش ہوئی کہ اس کا نیا اڈیشن دارالمصنفین ہی سے شایع ہو، جو شوق سے شایع کیا جارہا ہے،

ناظرین کو اس کتاب میں مرزا مظہر جانجاناں کے حالات و کمالات کی بڑی اچھی تصویر ملے گی، ان کی محفل انوار الٰہی سے معمور رہتی، جس میں فیض مصطفوی کا بھی پورا عکس ہوتا، ان کا تعلق نقشبندیہ قادریہ چشتیہ، احمدیہ یعنی مجددیہ سلسلے سے بھی رہا، اس لئے ان کے یہاں نسبت

نقشبندیہ کے استغراق و محویت، قادریہ کے لمعان و صفائے حالات، چشتیہ کے اذواق و اشواق،
اور احمدیہ کی لطافت تضارت دکھائی دیتی، پھر ان کے یہاں بڑی مذہبی رواداری بھی
ملتی ہے، ان کی تعلیم تھی کہ گذرے ہوئے لوگوں پر بغیر اس کے کہ شرع سے کفر ثابت ہو
کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں میں بھی بشیر و نذیر گذرے ہونگے ایسی
صورت میں رام اور کرشن ممکن ہے کہ ولی یا نبی رہے ہوں، مرزا صاحب کے یہاں جہاں حدیث
و تفسیر کی باتیں ہوتیں وہاں شعر و سخن سے بھی ذوق کی تازگی ہوتی رہتی، پھر وہ سپہگری میں
بھی مہارت رکھتے، تیروں کی بارش اور نیزوں کے وار میں بھی ایک غزل کہہ گئے علم موسیقی
سے بھی واقف تھے، ماہرین فن ان کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے حاضر ہوتے تھے کھانا
پکانا بھی خوب جانتے تھے، کپڑے قطع کرنے بیٹھتے تو شلوار کو پچاس طریقوں سے قطع کر لیتے اس کتاب
میں انکی دل آویز شخصیت کی ان رعنائیوں کی جو مرقع آرائی کی گئی ہے اس سے ناظرین ضرور محظوظ ہونگے،
انکی فارسی شاعری میں جذبہ رضا، وحدت شہود، جبر و قدر، فنا، وسعت مشرب، حیات انسانی کی
ناپائداری، واردات عشق کے جوش بیان اور اسلوب کی شگفتگی اور دلکشی کا بھی بڑا اچھا تجزیہ اس کتاب میں
ملیگا انھوں نے اردو کلام میں ایہام کی صنعت برج بھاشا اور دکنی الفاظ کو ترک کر کے اور ہندی الفاظ کے
استعمال میں جو توازن پیدا کیا پھر عربی اور فارسی الفاظ کو اردو میں صوتی لحاظ سے لکھے جانے کے بجائے اصلی شکل
میں لکھ کر اردو زبان میں جو صفائی اور شستگی پیدا کی، اس پر بھی اچھی بحث ہے جس سے ہمارے ناظرین ضرور
مستفیض ہوں گے، امید ہے کہ وہ اس کے مطالعہ کے وقت مرحوم مرتب کو ان کے ایصال ثواب
کے لیے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

ہیچمدان
سید صباح الدین عبدالرحمن
دارالمصنفین اعظم گڈھ

۲۰ر اپریل ۱۹۷۹ء

عبدالرزاق قریشی مرحوم

از:- جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب، پٹنہ،

ضلع اعظم گڈھ کی ایک چھوٹی سی بستی، بسم میں ۳۰ جولائی [illegible]ء کو عبدالرزاق قریشی، پہ ۹ بجے دن کو دل کا دورہ پڑا، دو تین بار قے ہوئی، ۱۰ بجکر دس منٹ پر "یا اللہ" کہکر آنکھیں بند کر لیں، اور پانچ منٹ بعد یہ خاموش، متین، سنجیدہ، سادہ مزاج اسکالر اور ادیب اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،

عبدالرزاق قریشی کم عمری میں بمبئی چلے گئے تھے، جہاں میری اور اُن کی رفاقت ۴۱ سال تک قائم رہی، اُن کا خاندانی ماحول کچھ ایسا حوصلہ افزا نہ تھا، کہ وہ کسی اسکول یا مدرسے کی تعلیم مکمل کر سکتے، اس کے باوجود وہ بمبئی آئے تو اپنے ساتھ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی لیتے آئے تشنگیِ علم انہیں مختلف چشموں تک لے گئی، مگر آخر میں میکدہ شبلی کے اس بادہ خوار کو جس ساقی کی تلاش تھی وہ ۱۹۳۲ء میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کی صورت میں نظر آگیا، جو دارالمصنفین کو چھوڑنے کے بعد پہلے گورنمنٹ کالج احمد آباد، پھر وہاں سے بمبئی کے ایک سرکاری کالج میں اردو کے پروفیسر ہو کر آگئے تھے، اعظم گڈھ کے باشندہ اور دبستان شبلی کے خوشہ چین کی حیثیت سے قریشی صاحب نے ندوی صاحب سے اپنا تعارف کرایا، طالب و مطلوب کی یہ ملاقات استاد اور شاگرد، بزرگ اور عزیز، دوست اور رفیق کی حیثیتوں میں تبدیل ہو کر زمانے کے بدلتے ہوئے لیل و نہار کے باوجود پوری وضعداری کے ساتھ ۱۹۳۲ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب

مرحوم کی زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رہی۔

عبدالرزاق قریشی نے ابتداءً تقریباً بمبئی کی اردو صحافت کی دنیا میں بھی دشت نوردی کی، پھر ایک مشن اسکول میں، اس کے بعد پارسی اسکول میں ٹیچر ہوکر پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ ایک گجراتی اسکول میں بھی پڑھایا، پھر انجمن اسلام ہائی اسکول (بمبئی) میں بھی اُردو اور فارسی کے مدرس ہوئے، یہاں انھوں نے طلبہ کو صرف اعلیٰ نمبر ہی کے لئے نہیں تیار کیا، بلکہ ان میں سے بیشتر طالب علموں میں زبان کا ستھرا ذوق بھی پیدا کیا۔ جتنے شوق سے وہ لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ وہ ان کے ذاتی مسائل کے حل کرنے میں بھی لگے رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کے شاگرد اُن کا نام بڑے احترام و عقیدت سے لیتے رہے، درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں تحریر و تقریر کا شوق پیدا کرتے، اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کا کام بھی وہ بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ مگر جیسے جیسے ان کا علمی معیار بلند ہوتا گیا، انھیں ہائی اسکول کا تدریسی میدان اپنے لئے تنگ نظر آنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں انجمن اسلام کے تحت ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ ۱۹۵۵ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی (کالج سے ریٹائر ہوکر) اس ادارے کے پورے وقت کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اس درمیان میں انسٹی ٹیوٹ سے عبدالرزاق قریشی کا تعلق گہرا ہوتا گیا، اور وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا میدانِ عمل انسٹی ٹیوٹ ہی ہوسکتا ہے، مگر دوسری طرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیاء الدین صاحب ان کے ایسے قدر شناس تھے کہ ان کو اسکول سے جدا کرنا گوارا نہ تھا، جب معاملہ میرے سپرد ہوا تو ایک روز میں نے خلیفہ صاحب سے کہا، "دیکھیے قریشی صاحب سے ہم اور آپ دونوں خصوصی تعلقات رکھتے ہیں، مگر ان کا ایک اہم کام آج تک ذکر پایا، یعنی ان کی شادی نہ کرا سکے، اس طرح تو وہ دنیا سے لاولد ہی رخصت ہوجائیں گے،

اب میں ان کی شادی کی تجویز لے کر آیا ہوں، وہ حیرت سے میرا منہ تکتے رہے، پھر بولے، "تمہید چھوڑیے، تجویز بیان کیجیے"۔ میں نے کہا، عبدالرزاق قریشی کا رشتہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک کر دیا جائے، جہاں سے ان کی تصنیفات معنوی اولاد کی صورت میں ظہور میں آ گئیں۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ متبسم ہوئے اور بولے، "رشتہ منظور"۔ اور ۱۹۶۲ء سے عبدالرزاق قریشی نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اپنا شریکِ حیات بنا لیا اور آخری دم تک اس رشتے کو اس طرح نبھایا کہ انتہائی معذوری کے سوا ایک دن ایسا نہیں گذرا جب کہ وہ بمبئی میں موجود ہوں اور یہاں حاضر نہ رہے ہوں، وہ یہاں اسکول ہی کی تنخواہ پر آئے، لیکن شادمانی اور انبساط کا یہ عالم تھا کہ جیسے انھیں یونیورسٹی کے پروفیسر کا گریڈ مل گیا ہو۔ جب تک رہے اسی نشہ میں سرشار رہے۔

ایک بار وہ چھٹی لے کر وطن گئے، اور وہاں علالت کی وجہ سے قیام میعاد سے زیادہ طویل ہو گیا، وہ تنخواہ پیشگی لے گئے تھے، واپس ہوئے تو خود ہی حساب لگا کر معلوم کیا کہ جتنی چھٹی ان کی جمع تھی اس سے دو چار دن زائد ہو گئے تھے، اکاونٹ آفس نے کوئی پرسش نہیں کی، کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہ چند دن اگلی چھٹی میں منہا کر دیے جائیں، مگر انھیں اطمینان نہیں ہوا، میں انجمن اسلام کا جنرل سکریٹری تھا، انسٹی ٹیوٹ کے انتظامی امور سے بھی میرا تعلق تھا، انھوں نے مجھے صورت حال سمجھائی، اور زائد دنوں کی تنخواہ واپس کرنے پر اصرار کیا، بڑی مشکل سے میں انھیں اس پر راضی کر سکا کہ وہ اُن کو نصف تنخواہ کی چھٹی میں منہا کرا دیں جو ان کے حساب میں جمع تھی۔

استغنا کی ایک شان یہ بھی تھی کہ نوادرِ ادب اور تحقیق و تالیف کے سلسلہ میں انھیں مختلف ادیبوں اور اسکالروں سے کافی خط و کتابت کرنی پڑتی تھی، ایک روز

میں نے انھیں ڈاکخانے کے عام قسم کے کارڈ اور اِن لینڈ کاغذ پر خطوط لکھتے دیکھا تو کہا "آپ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسٹیشنری اور ٹکٹ کیوں نہیں استعمال کرتے" ہنس کر فرمانے لگے: "بھائی! میں اپنی طرف سے انسٹی ٹیوٹ کی یہی چھوٹی سی خدمت تو کرتا ہوں"

اکتسابِ علم میں عبدالرزاق قریشی نے جتنی محنت، شوق اور تلاش سے کام لیا، وہ اپنی جگہ خود ایک مثال ہے، وہ ہر اتوار کو نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کے بنگلہ جوگیشوری پہونچ جاتے، ان کے ذاتی کتب خانہ میں اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا، یہ کتابیں اور ندوی صاحب کی ہدایتیں ہر اتوار کو قریشی صاحب کو وہاں کھینچ لے جاتیں، اس معمول پر وہ اس پابندی سے عمل کرتے کہ بمبئی کی بے تحاشہ بارش اور تیز و تند ہوائیں بھی انھیں اس گیارہ میل کے سفر سے کبھی باز نہ رکھ سکیں، صبح سے شام تک وہ مطالعے میں غرق رہتے، یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا اور اُس وقت ختم ہوا جب ان کی صحت بہت خراب ہو گئی اور وہ اتنی لمبی مسافت طے کرنے کے لائق نہیں رہے،

وہ اپنا ہر کام بڑی لگن کے ساتھ کرتے اور علمی کاموں میں خوب سے خوب تر کے قائل تھے، ان کی سیدھی سادہ زندگی دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا کہ وہ اپنے مسودے اتنے سلیقے، احتیاط اور اتنی نفاست کے ساتھ تیار کرتے ہوں گے، ان کا خط بڑا پاکیزہ اور پختہ تھا، تحقیقی کاموں میں وہ دوسرے درجہ کی چیز گوارا نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی، لیکن مغربی طریقہ تحقیق کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس پر عمل پیرا تھے، ان کی مختصر سی کتاب "مبادیات تحقیق" ریسرچ کرنے والوں کے لیے نہایت مفید ہدایت نامہ ہے، اور اردو زبان میں اپنے طرز کی شاید پہلی کتاب۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں عبدالرزاق قریشی ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے

شریک ہوئے، اپنے خاص موضوعات پر تحقیق کرنے کے علاوہ ادارے کے سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کی ادارت بھی سنبھالی اور رسالے کو جس بلند معیار اور وقار کے ساتھ ایڈٹ کیا اس نے ساری اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا جب ان کی وفات کی خبر ملی تو مجھے اور باتوں کے ساتھ نوائے ادب کی یاد آئی اور بے اختیار غالب کا شعر زبان پر آگیا، ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

عبدالرزاق قریشی نے بڑی تعداد میں ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے، تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ممبئی کی مشہور سوشل ورکر مسز کلثوم سایانی نے ۱۹۴۰ء میں ایک پندرہ روزہ اخبار "رہبر" نکالا تو کئی مہینوں تک اس کے سارے مضامین عبدالرزاق قریشی اور راقم الحروف نے مل کر لکھے، ان مضامین میں بڑی عمر کے لوگوں کی نفسیات سامنے رکھتے ہوئے سہل نگاری کا لحاظ بہت ضروری تھا، اخبار زبان اور مضامین دونوں حیثیتوں سے اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑے دنوں میں بہ یک وقت یہی اخبار اردو (ٹائپ) دیوناگری اور گجراتی تینوں رسم خط میں چھپنے لگا، اس کوشش کو ملک کے مشہور سربراہوں نے بہت سراہا۔

قریشی صاحب کے سترہ شایع شدہ مضامین کا مجموعہ تاثرات کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں شایع ہوا جس میں بعض کتابوں اور شخصیتوں کے متعلق ان کے تاثرات ہیں، مضامین میں ان کی انشا پردازی شبلی اسکول سے وابستگی ظاہر کرتی ہے اور کتاب کا معارف پریس میں طبع کرانا ان کی دارالمصنفین کے دلدادہ ہونے کی دلیل ہے،

مہاراشٹر کی ریاست میں (جو پہلے ریاست ممبئی کہلاتی تھی) اردو کی تعلیم میں خاصی

سہولتیں فراہم تھیں، پھر بھی بعض چیزیں خود اردو والوں کے کرنے کی تھیں، جب تک حکومت نے درسی کتابیں تو مہیا نے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، ایسی کتابوں کی تالیف واشاعت کا مسئلہ اردو والوں کے لئے منفعت بخش نہ ہونے کی وجہ سے قابل توجہ نہ سمجھا جاتا تھا، اوپر کی جماعتوں کی زبان دانی کی مناسب کتابیں مفقود تھیں، انجمن اسلام نے صورت حال کا جائزہ لے کر تالیف کا کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کیا، اور ان کی مرتب کی ہوئی ریڈریں "نگار اردو" کئی سال تک داخل نصاب رہیں، اور اس طرح ہزاروں اردو داں طلبہ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہی،

مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد اردو کانفرنس کی ایک نشست میں "اردو اور تحریک آزادی" موضوع بحث تھا، اسی نشست میں یہ خیال پیش ہوا کہ اگلے سال جب پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ سالگرہ منائی جائے تو اردو کی ایسی تحریروں اور نظموں کا جن سے ملک کی آزادی کی تحریکوں کو بڑی تقویت پہونچی، ایک انتخاب انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو، انجمن اسلام کے صدر سیف طیب جی بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے انجمن اسلام کی جانب سے انتخاب کے شائع کرنے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرلی، مگر بعض اسباب کی بنا پر انجمن ترقی اردو اس انتخاب کی ذمہ داری لینے پر رضامند نہ ہوئی، اور انجمن اسلام نے یہ کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کر دیا جو اس وقت تک انجمن کے لائف ممبر بن چکے تھے، اگلے سال مئی میں چار سو صفحات کا یہ انتخاب قریشی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ "نوائے آزادی" کے نام سے ٹائپ میں چھپ کر شائع ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اس کا پہلا نسخہ انجمن کے صدر نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا، یوں تو اس موقع پر جنگ آزادی اور تحریک آزادی کی تاریخیں ہندوستان کی ہر زبان میں لکھی گئیں، لیکن اردو کے سوا کسی زبان کو یہ فخر نصیب نہیں ہوا کہ وہ کوئی ایسا مجموعہ نثر و نظم کا پیش کرتی جس سے ثابت ہوتا، کہ وہ ملک کی تحریک آزادی میں معاون ہوئی ہو، یہ کتاب انجمن کے شعبۂ اشاعت (ادبی پبلشرز) کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے قریشی صاحب نے مرزا مظہر جانجاناں اور ان کے اردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ جب یہ کتاب کی صورت میں ان کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شایع ہوئی تو اردو کے ایک بڑے بلند پایہ محقق اور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی حیثیت سے پیش کر دی جاتی تو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی،

انسٹی ٹیوٹ کے تحقیقی پروگرام کے تحت انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ "دیوان غزلیات اور بارہ ماسہ" کا نایاب قلمی نسخے ایڈٹ کر کے شایع کرائے، پھر "اردو کا تمدنی سرمایہ" کے عنوان سے "نوائے ادب" میں ان کے کئی مضامین شایع ہوئے، موخرالذکر کام میں ان کی دلچسپی اتنی بڑھی اور اتنا مواد جمع کیا کہ ایک مستقل تصنیف کا مسودہ تیار ہو گیا جو اب دارالمصنفین کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

مبادیات تحقیق کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ قریشی صاحب کا تعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے قائم ہوا تو پوسٹ گریجوٹ کلاس کے طلبہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کی خاصی تعداد ان کے ارد گرد منڈلانے لگی، وہ لوگ ان سے مشورے کرتے، مقالے دکھاتے، مشکل مقامات کے حل طلب کرتے۔ عبدالرزاق قریشی مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی، بڑی خوش دلی کے ساتھ ان کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے محسوس کیا کہ بیشتر طلبہ تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقہ کار سے بے خبر ہوتے ہیں، کالج اور یونیورسٹی والے اس مفروضے کے تحت کہ طلبہ یہ باتیں خود ہی معلوم کریں گے، انھیں اس فن کی معلومات دینا غیر ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ اکثر مقالے اس طرح لکھے اور پیش کئے جاتے ہیں کہ جن کو پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے، قریشی صاحب نے مبادیات تحقیق میں وہ اصول بتائے ہیں جن سے مقالہ کی تیاری میں باضابطگی

پیدا ہوتی ہے

کردار کے اعتبار سے عبدالرزاق قریشی بڑے بلند مرتبے کے انسان تھے، وضعداری پسند کرتے اور اسے بناہنا بھی خوب جانتے تھے، ان کے عزیز اور رشتہ دار وطن سے علاج کیلئے بمبئی آتے تو یہ ان کے مشیر اور مددگار ہوتے، مرض کے لحاظ سے کسی ماہر طبیب کا انتخاب اس سے وقت طے کرنا، پھر بیمار کو وہاں تک لے جانا، ضرورت ہوئی تو اسپتال یا نرسنگ ہوم میں داخل کرانا اور اس وقت تک اسکا حال چال دریافت کرتے رہنا جب تک کہ اس کا قیام بمبئی میں رہتا ہے یہ سب ان کی زندگی کے معمول میں داخل تھا یہی سلوک وہ اکثر ان طالب علموں کے ساتھ بھی کرتے جن کے بارے میں انھیں شبہ ہو جاتا کہ وہ بغیر والی یا مددگار کے ہیں۔

عبدالرزاق قریشی راسخ العقیدہ تو ضرور تھے، مگر مذہبی فرائض کی ادائیگی میں شروع میں کوتاہی ہوتی رہی، میں جب بھی ان سے کہتا "حضرت! آپ پر صوم و صلوٰۃ کا حکم کب نازل ہوگا؟" تو وہ بڑے معصوم انداز میں مسکرا دیتے اور بس! پھر ایک وقت وہ آیا جب وہ عبادت کی طرف رجوع ہوئے، اور اس جوش و خشوع کے ساتھ عبادت میں مشغول دکھائی دینے لگے کہ انکے وہ احباب بھی جو بہت پہلے سے پابند صوم و صلوٰۃ تھے، ان کی عبادت پر رشک کرنے لگے انکے قلب کی اس تبدیلی کا راز افشا کرنا شاید اخلاقی جرم ہو، پھر بھی ان کی روح سے معذرت کرتے ہوئے بیان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ خود ان کا کہنا تھا کہ ایک روز وہ اپنے کمرے میں تنہا سو رہے تھے، فجر ہونے والی تھی، ابھی دھندلکا تھا کہ انھیں محسوس ہوا کہ اذان کی آواز آرہی ہے، اس سے پہلے ایسی آواز کبھی سنائی نہ دی تھی، ان کی آنکھ کھل گئی مگر وہ پلنگ پر لیٹے رہے، دوسرے دن پھر یہی ہوا، اس مرتبہ اذان کی آواز اور قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، پھر آنکھ کھلی اور یہ لیٹے رہے، تیسرے دن اور چوتھے دن بھی یہی بات ہوئی، ہر روز آواز قریب تر ہوتی گئی،

پھر ایک صبح ایسی آئی جب کہ انھیں، لگا جیسے اذان ان کے کانوں میں دی جا رہی ہو اور یہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے، کچھ دیر تک غور کرتے رہے، پھر اٹھے، وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے بیٹھ گئے۔ اس دن سے ان کی نماز شروع ہوئی، جس کی پابندی آخری دم تک قائم رہی۔ امسال وہ فریضۂ حج ادا کرنے کا عزم کر چکے تھے، مگر وقت آ گیا اور وہ سوئے عدم سفر پہ چلے گئے۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ریٹائر ہو کر ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ دار المصنفین میں رفیق بن کر کام کریں، اس کی پوری تیاری انھوں نے کر لی تھی، ذاتی کتب خانے کی اکثر کتابیں انھوں نے وہاں بھجوا دی تھیں، اور ارباب دار المصنفین بڑے شوق کے ساتھ ان کے لیے چشم براہ تھے، مگر۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عبد الرزاق قریشی کی پوری زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی زبان سے میر کا یہ شعر کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ سے آنکھیں

تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

مقدمہ

۱

میرزا جان جاناں مظہرؒ کا عہد سیاسی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ کا بڑا پُر آشوب عہد تھا، وسیع و مستحکم مغلیہ سلطنت کے حصے بخرے ہو رہے تھے، شیر دل بابر، حوصلہ مند اکبر اور مجاہدانہ زندگی بسر کرنے والے اورنگ زیب کی اولاد شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب کی طرف مائل تھی، لہو ترنگ کے بدلے جل ترنگ اسے مرغوب تھا،

اورنگ زیب کے مرتے ہی شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، آخر شہزادہ معظم کامیاب ہوا، اور ابو النصر قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے مغلیہ تخت پر بیٹھا، لیکن وہ صرف پانچ سال حکومت کرنے پایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا اور ایک بار پھر مغلیہ سلطنت کی روایت تازہ ہو گئی یعنی تخت و تاج کے لئے جنگ و قتال شروع ہو گیا، اس معرکے میں بہادر شاہ کے بڑے لڑکے کو کامیابی ہوئی اور وہ ابو الفتح معز الدین جہاندار شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا،

جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ مغلیہ حکومت کے اس زوال کی ابتداء ہوتی ہے،

جس کی انتہا ۱۸۵۷ء میں سراج الدین بہادر شاہ ثانی کے ہاتھوں ہوئی، وہ طبعاً عیش پسند تھا، خافی خاں کا بیان ہے کہ اس کے عہد میں رود و سرود کا بازار ایسا گرم ہوا کہ قریب تھا کہ قاضی قرابہ کش اور مفتی پیالہ نوش ہو جائیں[1]، اس کے حکم سے دہلی میں مہینے میں تین بار چراغاں ہونے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ تیل دہلی میں کمیاب ہو گیا، اور اس کی قیمت دو روپے سیر تک پہنچ گئی، جب تیل بالکل نایاب ہو گیا تو گھی کے چراغ جلائے جانے لگے، یہاں تک کہ وہ بھی نایاب ہو گیا[2]، ایک ادنیٰ درجے کی عورت لال کنور نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ سلطنت کے معاملات میں بھی دخیل ہو گئی، اسے امتیاز محل کا خطاب دیا گیا اور اس کے خاندان کے جملہ افراد کو جاگیریں اور خطابات عطا کئے گئے، انھیں امرا کی طرح اپنے دروازوں پر نوبت بجانے کی اجازت دی گئی[3]، خود لال کنور کے لئے دو کروڑ روپیہ سالانہ گھریلو اخراجات کے لئے منظور رہا، لباس اور جواہرات اس کے علاوہ تھے، ایک مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس طرح جہانگیر کے عہد میں نور جہاں کے نام کا سکہ چلا تھا اسی طرح جہاندار شاہ کے زمانے میں لال کنور کے نام کا سکہ جاری ہوا[4]،

جہاندار شاہ کے بھتیجے فرخ سیر نے حکومت کی بدنظمی سے فائدہ اٹھایا اور ساداتِ بارہہ کی مدد سے اس پر فوج کشی کی، وہ مقابلے کے لئے فوج لے کر چلا تو اس انداز سے کہ طوائفوں اور سازندوں کا بھی ایک لشکر ساتھ تھا، آخر فرخ سیر کامیاب ہوا اور جہاندار شاہ پہلے محبوس ہوا اور پھر قتل کر دیا گیا، لیکن اب تخت و تاج کے حقیقی مالک سادات بارہہ تھے،

فرخ سیر بھی عیش و عشرت کا دلدادہ نکلا، وہ ارادہ کا بھی کمزور تھا، اسے عمدہ لباس اور گھوڑوں کا بہت شوق تھا، اس زمانے میں ایک بار قحط پڑا، داروغۂ اصطبل نے غلے کی گرانی

---

[1] منتخب اللباب، جلد دوم، ص ۶۸۹ [2] ولیم اروِن، لے ٹر مغلز، جلد اول، ص ۱۱۲، بحوالہ خوشحال چند نادر الزمانی قلمی [3] ایضاً ص ۹۳، بحوالہ یحییٰ تذکرۃ الملوک، قلمی [4] ایضاً، جلد اول، ص ۱۹۴

کی شکایت کی، اس نے حکم دیا کہ فی گھوڑا ایک اشرفی یومیہ خرچ کرو[1]، اس کے گھوڑے برابر دانہ کھاتے رہے، فاقہ کرنے والے عوام تھے، اسی لئے لوگوں نے اسے بادشاہ دانہ کش کا لقب دیا تھا

ملک کی اس سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں نے ایک بار پھر پورے ہندوستان پر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کیا، سکھ لوٹ مار اور غارت گری پر اتر آئے، ان کے مظالم کی وجہ سے مسلمان اور ہندو دونوں ان سے متنفر ہو گئے، جب انھوں نے سرہند پر حملہ کیا تو بہت سے مسلمانوں نے اپنے ہندو دوستوں کے گھروں میں پناہ لی، انھوں نے مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم کرنے کے ساتھ ساتھ بزرگان دین کے مزارات کی بھی بے حرمتی کی، آخر جب گورداس پور فتح ہوا تو سکھوں کے پیشوا گرو بندا کو گرفتار کر کے دہلی لایا گیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا،

فرخ سیر کا زمانہ آتے آتے مرہٹوں نے اچھی خاصی طاقت بنالی تھی اور اب ساداتِ بارہہ نے انھیں اپنا بنانے میں مصلحت سمجھی اور اسی بنا پر انھوں نے مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کی اجازت دے دی، فرخ سیر نے اس کی مخالفت کی لیکن چونکہ سادات بارہہ اب کافی طاقتور ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے بادشاہ کے حکم کی مطلق پروانہ کی، سید حسین خاں مرہٹوں کی فوج لے کر دہلی پر چڑھ آیا، مرہٹوں نے وہ بربریت دکھائی کہ انسانیت تڑپ اٹھی،

عوام پر جو گذری وہ تو گذری خود بادشاہ (فرخ سیر) بھی مرہٹوں اور خصوصاً ساداتِ بارہہ کے بغض و کینے کا شکار ہو گیا، پہلے انھوں نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کیا اور پھر ایک ایسے حبس خانے میں رکھا جو قبر کی طرح تنگ و تاریک تھا، اس حبس خانے میں ایک طشت و آفتابہ اور ایک صراحی کے سوا کچھ اور نہ تھا[2]، کچھ دنوں

---

[1] ولیم اردن، Later Mughals، جلد ۱، ص ۲۹۰ [2] خافی خاں منتخب اللباب، جلد دوم، ص ۸۱۴،

بعد اسے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ رفیع الدرجات اور پھر سال ہی بھر بعد (اس کی موت کے بعد) اس کے بھائی رفیع القدر کو شطرنج کا بادشاہ بنایا، لیکن وہ بھی بہت جلد دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کے بعد ایک ہیژدہ سالہ نوجوان مغل شہزادہ روشن اختر نے ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ کے لقب سے مغلیہ تاج شاہی سر پر رکھا،

سادات بارہہ کی بادشاہ گری و بادشاہ کشی نے عوام و امرا میں بادشاہ دوستی اور سادات بارہہ کی طرف سے نفرت و بیزاری کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، آخر حساس و دانش مند اور تجربہ کار امرا کی کوششوں سے سادات بارہہ کا خاتمہ ہو گیا، اور اب یہ امید ہو چلی تھی کہ حالات رو بہ اصلاح ہو نگے، لیکن یہ امید بھی امید موہوم ثابت ہوئی، محمد شاہ کو مہمات سلطنت کی گتھیاں سلجھانے کا نہ دماغ تھا اور نہ فرصت، اس نے عیش امروز کو فکر فردا پر قربان کرنا دانی سمجھا، سلطنت کے دفاتر کو غرق مئے ناب کرنا اس کی رائے میں اولیٰ تھا، اس کے مزاج میں ترحم بھی ضرورت سے زیادہ تھا، پھر اس میں جرأت کی بھی کمی تھی اس لئے وہ امرائے مقتدر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا، وہ جوان اور عیش طلب تھا، اس لئے لہو لعب میں مصروف رہتا تھا[1]، اس کی تقلید امرا و وزرا کے علاوہ عوام بھی کرنے لگے اور اب اکبر قدم اور رنگ زیب کی دہلی ارباب نشاط اور شاہدان بازاری کا مرکز تھی، فنون لطیفہ ترقی پر تھے، محمد شاہ کا عہد حقیقت میں عیش و نشاط اور رامش و رنگ کا عہد تھا،

۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں بادشاہ، امرا اور رعایا کی شامت اعمال نے صورت نادر اختیار کی، نادر شاہ کے سفاکانہ حملے اور اس کے سپاہیوں کے قتل و غارت گری نے دلی کو ویران کر دیا، محمد شاہ نے چار کروڑ روپئے تاوان جنگ کے طور پر نادر شاہ کو دے

---

[1] غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، جلد سوم، ص ۸۷۰

لوٹ کا مال اس کے علاوہ تھا، بعض مؤرخین نے ستر کروڑ کا اندازہ لگایا ہے، مال غنیمت میں شاہ جہاں کا بنوایا ہوا تخت طاؤس بھی تھا، میرزا مظہرؒ کے ایک ہم عصر اور عزیز دوست میر عبدالحئی تاباں نے اس متاع عزیز کے چھن جانے پر اپنے داغہائے دل کو یوں نمایاں کیا ہے،

نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس — داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباںؔ

حقیقت یہ ہے کہ نادر شاہ کے حملے اور قتل و غارت گری نے مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے الفاظ میں "از سلطنت بجز نامی باقی نماندہ"[1]

محمد شاہ کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا ابو ظفر مجاہد الدین احمد شاہ تخت نشین ہوا تو وہ بھی اپنے باپ کا سچا جانشین نکلا، محمد شاہ نے نہ اسے کسی قسم کی تعلیم دی تھی اور نہ اس کی تربیت کی تھی، اس لئے اس کی خامکارانہ طبیعت سلطنت کے بارگراں کی متحمل نہ ہو سکی اور اس نے تمام شاہی اختیارات جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاتھ میں دے دیئے اور خود لہو لعب اور عیش و کامرانی میں مصروف رہنے لگا[2]، جاوید خاں جاہل مطلق تھا، اسے نہ انتظامی معاملات کا تجربہ تھا اور نہ اس نے کسی جنگ میں حصہ لیا تھا لیکن اب وہی جنگ و امن کے فیصلے کرنے لگا[3]، اس کی یہ ترقی اور اقتدار دیکھ کر امرا نے اپنی ذلت محسوس کی اور وہ بادشاہ کی طرف سے بدظن ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان بادشاہ اور قدیم امرا کے درمیان منافرت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی[4]،

---

[1] خلیق احمد نظامی، مرتبہ، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، مکتوب دوم [2] سرجدوناتھ سرکار، زوال سلطنت مغلیہ، جلد اول، ص ۲۹ - ۲۸ [3] ایضاً [4] سرجدوناتھ سرکار، زوال سلطنت مغلیہ جلد اول، ص ۲۹ - ۲۸، بحوالہ تاریخ احمد شاہی قلمی

جاوید خاں نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے نوجوان بادشاہ کی مے نوشی اور شاہد پرستی کے معاملے میں ہمت افزائی کی اور اس کے حرم کو عورتوں سے بھر دیا، آہستہ آہستہ اس کے گرد اوباشوں کا ہجوم ہو گیا، اور اس کی ذہنیت اس قدر پست ہو گئی اور اس سے ایسے افعال سرزد ہونے لگے جنھیں ملک کے دامن پر ایک بدنما داغ کہا جا سکتا ہے۔ محل سے لیکر ایک ایک کوس تک چاروں طرف صرف خوبصورت عورتیں نظر آتی تھیں اور بادشاہ اپنا سارا وقت ان عورتوں کے ساتھ باغوں اور مرغزاروں کی تفریح میں صرف کرتا تھا۔[1] نتیجہ یہ ہوا کہ انتظام سلطنت بے حد ابتر ہو گیا، اور سلطنت کی بنیادیں کمزور سے کمزور تر ہوتی گئیں،

اپنے عہد حکومت کے آخری دو تین برسوں میں احمد شاہ حکومت کے معاملات سے کچھ دلچسپی لینے لگا تھا، اور ہر روز باقاعدہ چھ گھنٹے[2] بغیر کچھ کھائے پیئے سلطنت کے کام انجام دیتا، ملک کے مختلف اطراف واکناف سے آئی ہوئی رپورٹیں پڑھتا، صوبے داروں کی مراسلتوں کے جواب دیتا، فریادیوں کی فریاد سنتا، فوجیوں کے رجسٹر کا معائنہ کرتا، انتظامی معاملات میں اپنے فیصلے لکھتا، لیکن ان تمام باتوں کا حالات پر کوئی اچھا اثر نہ پڑ سکا،

اولاً تو یہ کہ بادشاہ کسی سے مشورہ نہ لیتا بلکہ اپنی من مانی کرتا، اس لئے سلطنت کے معاملات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہ ہو سکی، دوسرے یہ کہ وقت مقررہ کے علاوہ وہ عوام کی نگاہوں سے کامل طور پر اوجھل ہو جاتا اور پھر بقیہ ۱۸ گھنٹے حرم کی عورتوں کی صحبت یا مرغزاروں کی سیر میں گذارتا، اب وہ بڑے سے بڑے وزیر سے بھی ملنے کے لئے

---

[1] سرجدوناتھ سرکار، زوال سلطنت مغلیہ، جلد اول، ص، ۳۳۹ بحوالہ تاریخ احمد شاہی قلمی

[2] ایضاً، ص ۳۴۰

آمادہ نہ ہوتا تھا، وہ جھنجلا کر کہتا کہ میں ہر روز کامل چھ گھنٹے امور سلطنت کو انجام دینے میں صرف کرتا ہوں اس کے علاوہ مقررہ اوقات پر دربار کرتا ہوں، اب جب کہ میں اپنے دماغ کو سکون اور جسم کو راحت دینا چاہتا ہوں تو تم مجھے تکلیف دینے آئے ہو۔[۱]

احمد شاہ کے بعد معزالدین جہاں دار شاہ کا لڑکا اور شاہ عالم بہادر شاہ کا پوتا عزیزالدین عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا، اس نے اپنے پردادا اورنگ زیب کو اپنے لئے نمونہ بنایا، لیکن ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آفتاب سے کیا نسبت! وہ تخت پر بیٹھا ہے تو اس کی عمر پچپن برس کی تھی، خرابیٔ صحت کے علاوہ اخلاقی حیثیت سے بھی وہ پست تھا، اس کی تخت نشینی کے بعد طوائف الملوکی نے بد سے بدتر شکل اختیار کر لی،

مرکز کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے ملک میں مختلف باغیانہ طاقتیں ابھر آئیں، دکن میں شورش برپا ہوئی، جاٹوں نے اودھم مچائی، روہیلوں نے ملک گیری کی ہوس کی، سکھ آمادۂ فساد ہوئے، مرہٹوں نے ہندوستان کی سلطنت کا خواب دیکھنا شروع کیا، امراء و وزراء نے سازشوں کا جال بچھایا، فوج میں ابتری پھیل گئی، اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوئی کہ انگریز ملک کے ان نفاق انگیز حالات اور امرا کے غدارانہ رویے سے فائدہ اٹھانے لگے اور انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہونے لگیں، مغلیہ سلطنت کو جس قدر زوال آتا گیا، انگریزی سلطنت کی بنیادیں اسی قدر مستحکم ہوتی گئیں اور اس کے حدود بڑھتے گئے،

نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ محمد شاہ کے آخری عہد حکومت میں ہوا تھا اور اسے شکست بھی ہوئی تھی، لیکن اس کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا، اس نے

---

[۱] سرجدوناتھ سرکار، زوال سلطنت مغلیہ، جلد اول ص ۲۳۳ [۲] ایضاً بحوالہ تاریخ احمد شاہی، قلمی۔

۲۲ سال کی مدت میں ۹ بار ہندوستان کے مختلف مقامات پر حملے کئے اور پہلے حملے کے سوا ہر حملے میں دشمن کو شکست دی اور ہر بار کافی مال و متاع ہندوستان سے لے گیا،

ابو المظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی آخری بادشاہ ہے جس کا تعلق حضرت میرزا مظہرؒ کے دور زندگی سے ہے، اس کا عہد بھی ایسا ہی پر آشوب تھا جیسا کہ اس کے پیش روں کا تھا، اگرچہ ملک میں خطبہ اسی کے نام کا پڑھا جاتا تھا اور سکے پر یہ شعر کندہ ہوتا تھا،

سکہ زد بر ہفت کشور شاہ عالم بادشاہ — حامیِ دینِ محمد سایۂ فضلِ الٰہ

لیکن حقیقت وہی ہے جس کا اظہار میر نے ذکر میر میں کیا ہے، یعنی اس کی بادشاہی محض "تہمت" تھی، اسی حقیقت کا اظہار مصحفی نے بھی مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے،

شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے — کہتی ہے اسے خلق جہاں سب شہ عالم

وہ تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور تجربے کار ضرور تھا لیکن متلون مزاج تھا، پھر سلطنت کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے، ایک طرف مرہٹے موقع سے فائدہ اٹھا رہے تھے، دوسری طرف جاٹ طاقت پکڑتے جا رہے تھے، تیسری جانب روہیلے بادشاہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، اور سب سے بدتر یہ کہ انگریزوں کے قدم مضبوط سے مضبوط تر ہو رہے تھے، خود شاہ عالم کا وزیر عماد الملک اس کا دشمن تھا، بادشاہ مرہٹوں کا خصوصاً دست نگر تھا، کیونکہ انھیں کی بدولت اسے تخت ملا تھا، جب انگریزوں کی سفارش پر اس نے نجف خاں کو امیر الامرا بنایا تو اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا، امرا کے آپس کے نفاق نے سلطنت کو اور کمزور اور حالات کو بدتر بنا دیا تھا، خزانہ بھی خالی تھا، خالصے کی زمینیں شاہ عالم کے ایک معاصر کے بیان کے مطابق ستر پرگنے تک محدود ہو گئی تھیں ان میں سے بھی بعض پر نجف خاں قابض تھا اور بعض پر اس کے نام سے افراسیاب[۱]، افراسیاب نجف خاں اور اس کی بہن

---

[۱] فرینکلن (Shah Alam And His court)، ص ۶۳

خدیجہ سلطان کا متبنیٰ تھا[1]،

مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ مرہٹوں کی مدد سے روہیلوں پر فتح پانے کے بعد شاہ عالم محمد شاہ رنگیلے کے نقشِ قدم پر چلنے لگا تھا اور ہمہ تن عیش و عشرت بن کر رہ گیا تھا[2]، پولٹر نے بھی اسے عیاش اور کاہل کہا ہے[3]، پولٹر نے اس کے دو بڑے عیب بتائے ہیں، ایک یہ کہ وہ دوسرے ہندوستانی حکمرانوں کی طرح خوشامد پسند تھا اور دوسرا یہ کہ خود غرض تھا، وزیر یا درباری پر اس کی مہربانی اور شفقت اسی وقت تک رہتی جب تک وہ دربار سے متعلق رہتا، دربار سے تعلق ختم ہونے کے بعد وہ انتہائی بیگانگی برتتا[4]،

شاہ عالم کے زمانہ میں مغلیہ سلطنت اتنی مختصر ہو گئی تھی کہ کسی دل جلے نے یہ پھبتی کہی تھی، سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم،

ان تمام شورشوں اور ہنگاموں کی جن کا اوپر ذکر ہوا، آماجگاہ دہلی تھی، اسی لئے ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "شاہ جہان آباد کہ از زمینش فتنۂ تازہ بجای گیاہ می روید[5]، میرزا مظہرؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کسی مرید کو لکھتے ہیں کہ "ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند[6]، اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "اختلال حال شہر کہ (دہر) روز فتنۂ تازہ گل می کند و ترسی دیگر در خواطر مردم می نشیند[7]"

---

۱ امتیاز علی خاں عرشی، مرتبہ نادرات شاہی، مقدمہ، ص، بحوالہ جام جہاں نما، قلمی ۲ کتاب مذکور، ص ۶۹، ۳ کتاب مذکور، ص ۶۹ - ۶۸ ۴ سید غلام علی نقوی، عماد السعادت، ص ۷۳، ۵ کلمات طیبات، مکتوبات مرزا صاحب مکتوب پنجاہ و چہارم، ص ۵۲ ۶ خلیق احمد نظامی، مرتبہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مکتوب ہشت و دہم، ص ۲۷،

یہ وہی دہلی ہے جو ہر عہد میں ملک کا اہم ترین مقام اور پُرشکوہ و باجبروت شہنشاہوں کا دارالسلطنت رہ چکی تھی اور جس کی مدح میں کبھی بلبل ہند امیر خسرو نے یہ ترانہ چھیڑا تھا؛

حضرت دہلی کنف دین و داد — جنت عدن است کہ آباد باد

ہست چو ذات ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات

ملک ز دروازۂ از فتحیاب — سیزدہ دروازہ وصد فتحیاب

نام بلندش رہ بالا گرفت — تا بہ ختن شد رہ یغما گرفت

گر شنود قصۂ ایں بوستاں — مکہ شود طائف ایں ہندوستاں

جسے ضیاء الدین برنی نے "رشک بغداد، غیرت مصر، ہمسر قسطنطنیہ، موازی بیت المقدس"[1] کہا تھا، اب اسی دلی کی بربادی کا مرثیہ میرزا مظہرؒ کے ہم عصر میرزا سودا اس طرح پڑھتے ہیں،

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گذر — نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار

نخل نے بار پڑے سوکھی پڑی ہیں روشیں — خاک اڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار

مسکراتا تھا جہاں غنچۂ و گل ہنستا تھا — اشک شبنم کے بھی قطرے کے نہیں واں آثار

جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد — مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے اک بار

دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر — عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار

بدم سرد و بصد حسرت و صد سوز جگر — دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالۂ و زار

حیف! در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روی گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۴۹،

جس دلی پر کبھی میر تقی میر نے یوں فخر کیا تھا

ہفت اقلیم ہر گلی ہے، کہیں — دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اب اسی کی بربادی پر وہ اس طرح ماتم کرتے ہیں،

اب خرابہ ہوا جہان آباد — ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے — پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابہ
جس خاک خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں — واں ہم نے ان ہی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں

سیاسی انتشار و شورش کا اثر ملک کے اقتصادی و تمدنی حالات پر پڑنا ناگزیر تھا، اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ معرکہ آرائی میں گذرا، ان جنگوں میں کروڑوں روپے صرف ہوئے ہوں گے، لیکن اس کے باوجود اورنگ زیب کے حسن انتظام اور تدبیر کی بدولت ملک کی اقتصادی حالت پر برا اثر نہ پڑا، اس نے چوبیس[۲۴] کروڑ روپئے آگرے کے قلعے میں چھوڑے تھے[۱]، مگر اس کے جانشینوں کی غلط فیاضیوں اور عیاشیوں نے بہت جلد خزانہ خالی کر دیا، مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بہت سے صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور بہتوں پر جاٹوں اور مرہٹوں نے قبضہ کر لیا تھا، اس لئے لگان کی رقم بہت کم ہو گئی تھی، عالمگیر ثانی کے زمانہ میں اقتصادی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی، خالصہ کی زمینیں کم ہو نے کی وجہ سے خود شاہی خاندان معاشی بدحالی میں مبتلا تھا، سر جدو ناتھ سرکار ایک مخطوطے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ۱۰ مئی ۱۷۵۵ء کو بادشاہ سواری نہ ہونے کی وجہ سے محل سے مسجد تک چل کر گیا[۲]،

---

[۱] ولیم اروِن، Later Moghals، جلد ا، ص ۱۲، [۲] زوال سلطنت مغلیہ جلد دوم، ص ۲۶، بحوالہ تاریخ عالمگیر ثانی، قلمی

اسی مغلیہ دورِ حکومت کی بات ہے کہ دولت کی فراوانی اور امرا کی فضول خرچی کا یہ حال تھا کہ بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ قمرالدین خاں (وزیر محمد شاہ) کے گھر کی عورتیں آخری غسل گلاب سے کرتی تھیں اور ایک دوسرے نواب کے یہاں تین سو روپئے روز کا صرف پھول اور پان عورتوں کے لئے جاتا تھا،[1]

شہزادوں اور شہزادیوں کی حالت بھکاریوں سے بھی بدتر تھی، شاکر خاں جو شہزادۂ عالی گوہر کا دیوان تھا کہتا ہے کہ ایک دن میں خیرات خانے کا شوربا شاہی معائنے کے لئے شہزادے کے پاس لے گیا تو اس نے کہا کہ یہ محل کی بیگمات کو دے دو کیونکہ حرم کے مطبخ میں تین دن سے چولھا نہیں جلا ہے،[2] ایک دن قلعے کی بیگمات نے بھوک سے بیتاب ہو کر محل سے نکل کر شہر میں جانا چاہا، شدتِ گرسنگی میں انھیں اپنی بے پردگی کا بھی خیال نہ رہا، لیکن چونکہ قلعے کے دروازے بند تھے، اس لئے وہ مجبور ہو کر وہیں بیٹھ رہیں، اور ایک دن اور ایک رات وہیں بیٹھی رہ گئیں، اور بڑی مشکل سے انھیں محل میں واپس لایا گیا،[3]

اندرونی خلفشار اور احمد شاہ ابدالی کے سپاہیوں کی دست درازی کی وجہ سے غلہ بے انتہا گراں ہو گیا، مونگ کی دال اس قدر کمیاب ہو گئی کہ اس کی قیمت دو روپئے سیر ہو گئی، مرہٹوں کی غارت گری کا اثر خصوصاً دواؤں پر زیادہ پڑا، دوائیں گراں اور کمیاب ہو گئیں،[4]

اس صورت حال سے فوجوں کا متاثر ہونا لازمی تھا، نہ سپاہیوں کو وقت پر تنخواہ ملتی تھی اور نہ گھوڑوں کو ٹھکانے سے خوراک نصیب ہوتی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ سپاہی اپنے گھر کا سامان گروی رکھ کر اپنا اور اپنے بچوں کا اور اپنے جانور کا پیٹ پالتے تھے، عالمگیر ثانی

---

[1] مولانا مناظر احسن گیلانی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، ص ۲۰۱، [2] سر جدو ناتھ سرکار زوال سلطنت مغلیہ، جلد دوم، ص ۲، [3] ایضاً، ص ۳۷، [4] ایضاً، ص ۱۵۴،

کے زمانے میں تو سپاہیوں نے عاجز آکر شہریوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا[1]

سیاسی شورش، معاشرتی انحطاط اور اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے عام اخلاقی معیار بھی پست ہو گیا تھا، عاقبت سے بے نیاز ہو کر جام و دل آرام سے زندگی گذارنا اونچے لوگوں کا شیوہ بن گیا تھا، اگرچہ امرا میں حربی فنون کی تعلیم برابر جاری رہی لیکن ان کی عیش کوشی نے انھیں اپاہج سا اور نکما بنا دیا تھا، وہ جنگ پر بھی جاتے تھے تو سامانِ طرب کے ساتھ جاتے تھے، شراب نوشی عام ہو گئی تھی، طوائفوں کی گرم بازاری تھی، مختصر یہ کہ اس دور میں ہندوستان کی اخلاقی حالت انتہائی پست ہو گئی تھی۔

نیک طبع لوگ جن میں اخلاقی قدروں کا احساس باقی تھا تصوف کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے تھے، لیکن سیاسی بے چینی، معاشی زبوں حالی اور تہذیبی انحطاط نے عام طور پر لوگوں کو اس قدر مایوس و وہم پرست بنا دیا تھا کہ وہ مذہب و تصوف کے نام سے طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا ہو گئے تھے، ایرانی اثرات کی وجہ سے شیعیت کا بھی زور تھا سنیوں نے شیعوں کی بہت سی رسمیں، مثلاً محرم کی تعزیہ داری، حضرت علیؑ کی شکل کشائی، یا علی کا نعرہ وغیرہ اختیار کر لی تھیں، عقیدے میں تزلزل آجانے کی وجہ سے قبر پرستی، پیروں کے عرس وغیرہ کا اس عہد میں بڑا زور رہا اور اس سلسلے میں نئی نئی رسمیں جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، وجود میں آئیں، اس رسموں کو مقدس فریضے کی طرح ادا کیا جاتا تھا، اوہام پرستی اور رسم و رواج کی پابندی میں ہندو اثرات کا بھی بڑا دخل ہے، میرزا مظہرؒ کے مرید اور خلیفہ (مولوی) نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ۔

اکثر عورتیں جہالت کی وجہ سے شرک اور اہل شرک کے مراسم کی ادائی میں مبتلا ہیں،

---

[1] سر جدوناتھ سرکار، Fall of the Mughal Empire جلد ۲، ص ۱۲۶

امراض کی حالت میں خصوصاً چیچک (سیتلا) کی بیماری میں کم عورتیں ایسی ملیں گی جو شرک نہ کرتی ہوں۔ دیوالی کے موقع پر مسلمان جہلا اور خصوصاً ان کی عورتیں اہل ہنود کی رسمیں بجالاتی ہیں اور اپنی عید کی طرح اسے مناتی ہیں، وہ اپنی بیاہی لڑکیوں کے یہاں ہندوؤں کی طرح تحفے تحائف بھیجتی ہیں، برتنوں کو رنگ کرا اور ان میں رنگین چاول رکھ کر بھیجتی ہیں اور ایسے دنوں کو اہمیت دیتی ہیں، اسی طرح وہ مشائخ کے نام پر جانور نذر کرتی ہیں، اور ان کی قبروں پر جاکر ان کو ذبح کرتی ہیں، وہ پیروں اور بی بیوں کے نام سے روزہ رکھتی ہیں، یہ نام انھوں نے تراش لئے ہیں، وہ افطار کے لئے خاص خاص قسم کے کھانے پکاتی ہیں اور ان روزوں کے توسل سے ان سے (پیروں اور بی بیوں سے) اپنی مرادیں مانگتی ہیں اور (اگر پوری ہوگئیں) وہ اسے ان کی طرف منسوب کرتی ہیں، اکثر افطار کے وقت وہ حرام باتوں کی مرتکب ہوتی ہیں اور بلاوجہ بھیک مانگ کر اس سے روزہ افطار کرتی ہیں اور اپنی حاجت پوری ہونے کو اس ممنوع فعل کی طرف منسوب کرتی ہیں۔[1]

ملفوظات میرزا صاحب میں ہے کہ "عمل بعزیمت نمودن و تقوی گزیدن دریں وقت سخت متعذر است کہ معاملات تباہ شدہ و عمل موافق شرع گویا موقوف گردیدہ، اگر بر طبق روایت فقہ و ظاہر فتوی عمل نمودہ آید و از محدثات امور بدعت اجتناب کردہ شود، بسیار غنیمت است۔"[2]

ان حالات کی اصلاح کے لئے دہلی کے ایک علمی خاندان کے ایک ممتاز فرد حضرت شاہ ولی اللہؒ اٹھے، شاہ صاحب نے اپنے تاریک دور میں جو روشنی کی وہ حقیقت میں اس شمع کا پرتو تھی جو تقریباً دو صدی پہلے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر و جہانگیر کے عہد میں روشن کی تھی

۱؎ معمولات مظہریہ، ص ۳۹۔۴۰، ۲؎ کلمات طیبات، ص ۷۷،

اور جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو لادینی کی تاریکی میں گمراہ ہونے سے بچالیا تھا، شاہ صاحب کے زمانے میں اسلامی ہند بڑی حد تک عربی سے بے گانہ ہو چکا تھا، قرآن مجید کی تلاوت محض خیر و برکت کی خاطر کی جاتی تھی، اس کے معنی و روح سے کوئی واسطہ نہ تھا اس لئے ان کا پہلا اصلاحی قدم قرآن مجید کے فارسی ترجمے کی شکل میں اٹھا، اس کے بعد انھوں نے امام مالک کی موطا کی فارسی شرح لکھی تاکہ مسلمان صحیح احادیث سے اچھی طرح واقف ہو سکیں، ایک رسالہ عقد الجید لکھا جس میں اجتہاد کی ضروریات اور احکام بتائے لیکن شاہ صاحب کی عظمت و تقدس اور علمی فضل و کمال کی عمارت کا سب سے عظیم ستون ان کی لازوال تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے،

عقائد و خیالات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے معاشرتی اصلاح کی بھی کوشش کی، وہ اسلامی معاشرے کو ہندوانہ رسوم اور ایرانی تکلفات سے پاک کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلمانوں کو معاشرتی حیثیت سے عہد رسالت کی سادہ و بے تکلف زندگی تک پہنچانے کی سعی کی،

شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا تو ان کے لائق فرزندوں (شاہ عبد العزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اور شاہ عبد القادرؒ) نے ان کے اہم اور مقدس کام کو جاری رکھا،

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شاہ صاحب اپنی اصلاحی کوششوں میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوئے، لیکن بقول شیخ محمد اکرم "اس بزرگ کی کوششوں سے اتنا ہوا کہ جب اس سیلاب (سیاسی حالات کا انقلاب) کے بند ٹوٹے تو .... مغلوں کا تخت و تاج تو اس سیلاب میں بہ گیا لیکن تسبیح و سجادہ سلامت رہے، اور سیاسی زوال کے ساتھ دینی انحطاط شروع نہیں ہوا[1]"

---

[1] شیخ محمد اکرم، رود کوثر، ص ۴۹۲

شاہ صاحب کی اس اصلاحی کوشش میں علمائے فرنگی محل کا بھی حصہ ہے، انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے صحیح اسلامی تعلیم کی اشاعت کی کوشش کی، ان کے علاوہ اس عہد کے بعض مشائخ وصوفیہ نے بھی حصہ لیا، ان میں شاہ فخر الدین اور میرزا جان جاناں مظہرؒ کے نام سب سے نمایاں ہیں، اگرچہ میرزا صاحب نے شاہ صاحب کی طرح علی الاعلان اصلاح کا کام نہیں کیا کیونکہ وہ صوفیٔ خانقاہ نشین تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شاہ صاحب کی اپنے مفید مشوروں سے مدد کرتے رہتے تھے، شاہ صاحب ان کے مداح ہی نہیں بلکہ معتقد ہیں، اس کا ایک ثبوت وہ چند خطوط ہیں جو انھوں نے میرزا صاحب کے نام لکھے تھے[۱]، اگرچہ میرزا صاحب کے مریدوں کی بڑی تعداد روہیل کھنڈ میں تھی لیکن ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ان کے مرید تھے، اس طرح ان کا سلسلۂ فیض تقریباً سارے ہندوستان میں جاری تھا۔

۲

شمالی ہند میں اردو شاعری کا مسلسل اور باقاعدہ چرچا ولی گجراتی سے شروع ہوتا ہے، ولی سے قبل بھی شمالی ہند میں اردو شاعری کے نمونے ملتے ہیں جعفر زٹلی کی زٹلیات کے علاوہ فائز دہلوی، افضل حسین نوری، اسماعیل امروہوی وغیرہ کا کلام مختلف اصناف میں موجود تھا، انھوں نے شمالی ہند کی اردو شاعری پر کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑا، وہاں کی شاعری نے ادبی و پایدار حیثیت ولی کے کلام سے متاثر ہونے کے بعد اختیار کی،

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ "سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں، اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذومعنین الفاظ اور ایہام پر

---

[۱] کلمات طیبات، مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ، اول تا چہارم،

دوہروں کی بنیاد ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ اردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی۔[1]

ایہام کے التزام میں تصنع و تکلف سے کام لینا پڑتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کی توجہ، جذبات و محسوسات سے ہٹ کر صرف لفظوں تک محدود رہ گئی، یعنی شاعری لفظوں کا کھیل بن گئی، فنی و عروضی حیثیت سے یہ اشعار ہر طرح سے نوک پلک سے درست ہوتے تھے لیکن لطف و اثر سے خالی، نہ ان میں جذبات کی عکاسی ہوتی تھی اور نہ درد مند دل کی تڑپ، نہ ان میں بلند تخیلی ہوتی تھی اور نہ دلکش و جان دار اسلوب بیان، یہ ایسے پھول تھے جو دور سے خوشنما معلوم ہوتے تھے، نزدیک پہنچ کر دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ یہ مصنوعی پھول ہیں، نہ ان میں خوشبو ہے اور نہ ان کی رنگت میں دلکشی، محمد شاہی دور کے شعراء نے اس طرز کو خصوصیت سے اپنایا، ان میں شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ، محمد شاکر ناجی، شرف الدین مضمون وغیرہ کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں،

کچھ دنوں تک اس طرز شعر گوئی کو مقبولیت حاصل رہی، لیکن غیر فطری چیز بہت دنوں تک پنپ نہیں سکتی، چنانچہ اس غیر فطری شاعری کو بھی زوال آیا، یہاں تک کہ ایہام گوئی کے علمبردار شاہ حاتم بھی اس طرز سخن کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے، ۱۱۶۹ھ میں جب انھوں نے اپنے ضخیم دیوان کا انتخاب "دیوان زادہ"، کے نام سے کیا تو اس طرز کے اشعار کو خارج کر دیا اور اس کی پروا نہ کی کہ اس خصوصیت کے فقدان کی وجہ سے ان کا کلام قبولیت عام حاصل نہ کر سکے گا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

مجھ کو مخالفوں کی بدی سے نہیں ہے خوف ۔۔۔ جو ہو سو ہو، ہے اپنے مجھے کام پر نگاہ

اور اب ان کا یہ دعویٰ تھا،

---

[1] آبحیات، ص ۸۰،

حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ بے تلاش

لیکن ایہام گوئی کا یہ سلسلہ اصلاحی کوششوں کے باوجود کچھ عرصے تک جاری رہا سودا کے یہاں بھی دو ایک غزلیں اس رنگ میں ملتی ہیں، اگرچہ انھوں نے اس کی صفائی بھی پیش کردی ہے،

مضمون واہ کا ہے سودا یہ سلسلہ اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ

میر حسن کا عہد سودا کے بعد کا ہے، لیکن انھوں نے بھی اس رنگ میں چند اشعار کہے ہیں، مگر یہ طرز بہرحال متروک ہو چکی تھی، اور اس کی طرف سے عام بیزاری کا جذبہ دلوں میں پیدا ہو چکا تھا،

اس غیر فطری طرز سخن کی اصلاح کی طرف جس شاعر نے سب سے پہلے توجہ کی وہ میرزا مظہرؒ ہیں، میرزا صاحب کے بلند مذاق سخن، نکتہ وری اور نکتہ سنجی کو ان کے تمام ہم عصر تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے، انھوں نے اپنے فارسی کے بیس ہزار اشعار میں سے صرف ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا، یہ ان کی وسعت قلب و نظر کے علاوہ سخن فہمی و سخن سنجی اور شاعرانہ بلند مذاقی کا بین ثبوت ہے، انھوں نے فارسی اشعار کا اتنا عمدہ انتخاب (خریطۂ جواہر) تیار کیا جو بقول میرزا غالب اس عہد کے لوگوں کے مذاق شعری کی اصلاح کا سبب بنا[1] ان کی اس مصلحانہ اولیت کو ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے، ان کے بیانات میرزا صاحب کی اردو شاعری کے سلسلے میں ان کی اصلاحی کوششوں کے زیر عنوان نقل کیے جا چکے ہیں،

میرزا صاحب کے علاوہ ان کے معاصرین میں سے جنھوں نے اس تحریک میں حصہ لیا شاہ حاتم، خواجہ درد، قائم، سودا میر اور مرزا مظہرؒ کے شاگرد یقین کے نام اہم ہیں، شاہ حاتم نے جیسا کہ ابھی اوپر کہا گیا اپنے ضخیم دیوان سے اس رنگ کے اشعار خارج کر کے اس طرز سخن

---

[1] مقالات شبلی جلد پنجم، ص ۱۲۹،

سے اپنی انتہائی بیزاری کا ثبوت دیا، اب ان کا یہ قول تھا،

ان دنوں سب کو ہوئی ہے صاف گوئی کی تلاش
نام کو حاتم کہیں چرچا نہیں ایہام کا

قائم ایہام گوئی کو "ستم" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی رائے میں محمد شاہی عہد کے ایہام گو شعراء نے شعر کو مرتبۂ بلاغت سے گرا دیا ہے[1]، انھوں نے ایک قطعے میں بھی ایہام گوئی کی مذمت کی ہے،

ہو روم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چین
یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سرِ شام

بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

خواجہ درد کا ارشاد ہے

از بسکہ ہم نے حرف دوئی کو مٹا دیا
اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

سودا کہتے ہیں کہ،

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

میر تقی میر اس عیب کو دور کرنے پر یوں اظہار فخر کرتے ہیں،

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

یہ دور اس نقطۂ نگاہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ طرز سخن کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس میں اصلاح زبان بھی ہوئی، اس دور کے آغاز تک بقول صاحب شعر الہند،

"سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکنی الفاظ کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے اور عربی فارسی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی، چنانچہ صاحب تاریخ شعرائے اردو نے شاہ مبارک کے حال میں لکھا ہے،

---

[1] قائم چاندپوری، مخزن نکات، ص ۴،

مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام اس سے زیادہ ہے۔[۱]

اس اہم مسئلے کی طرف سب سے پہلے حاتم نے توجہ کی، چنانچہ وہ اپنے دیوان زادہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"دریں ولا ایں تربیت طلب از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی وزبان فارسی کہ قریب الفہم وکثیر الاستعمال باشد روزمرۂ دہلی کہ مرزایان ہند وفصیحان رند در محاورہ (محاورہ) دارند منظور داشتہ سوای آں زبان ہر دیار تابہ ہندوی کہ آں را بھاکا گویند موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم وخاص پسند بود اختیار کردہ وشمہ از آں الفاظ کہ تقید دارد بہ بیان می آرد. چنانچہ عربی وفارسی مثلاً تسبیح را تسبی وصحیح را صحی وبیگانہ را بگانہ ودیوانہ را دوانہ ومانند آں بطور عامہ یا متحرک را ساکن وساکن را متحرک۔۔۔ یا الفاظ ہندوی کہ نین جگ۔۔۔ وغیرہ آنچہ باشند یا لفظ مار ومواد ازیں قبیل کہ برخود قباحت لازم آید یا بجای سے ستی یا سیتی یا اودھر را ادھر وکدھر را کیدھر وراں زیادتی حرف باشد یا یہاں رایاں ووہاں را واں کہ در مخرج تنگ بود۔۔۔ یا قافیہ را فارسی را با را ہندی چنانچہ گھوڑا وبورا وسر ودھڑ ومانند آں۔۔۔ وایں قاعدہ را تا کجا شرح دہد غرض کہ خلاف محاورہ (محاورہ) وغیرہ مصطلح وغلطی روزمرہ ونقصان فصاحت را دخل نباشد العاقل یکفی الاشارہ۔"[۲]

---

[۱] مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند ج ۱، ص ۷۹ [۲] سید محی الدین قادری زور، سرگزشت حاتم ص ۱۲۶۔

خواجہ درد، قائم وغیرہ نے بھی اس اصلاحی تحریک میں حصہ لیا اور اپنے کلام سے قدیم زبان کے بہت سے الفاظ نکال ڈالے، میرزا صاحب کی اردو شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے کہ ان کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس اصلاحی تحریک میں علمی حصّہ لیا، ان کے یہاں کدھی، نسدن، جیو، کیتا، انجھو، دوج وغیرہ قسم کے الفاظ نہیں پائے جاتے، اسی طرح اور جن باتوں کی طرف شاہ حاتم نے اشارہ کیا ہے، ان سے میرزا صاحب کا کلام بڑی حد تک پاک ہے، لیکن اس اہم کام کو انجام تک پہنچانے کی عزت دراصل میر و سودا کے مقدر میں تھی، چنانچہ میر صاحب نے اس پر فخر کا اظہار بھی کیا ہے، فرماتے ہیں،

ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

سودا کو بھی اپنے اس کارنامے پر ناز ہے، کہتے ہیں،

تو نے سودا وہ زبان ریختہ ایجاد کی
پڑھ کے اک عالم اٹھاتا ہے ترے اشعار فیض

اس اصلاحی کوشش سے فائدہ یہ ہوا کہ زبان صاف ہو گئی، اس میں شستگی درائی آگئی اور اسلوب بیان جان دار و دلکش ہو گیا لیکن فارسی کا اثر اتنی شدت سے پڑا کہ بہت سے اچھے الفاظ بھی متروک ہو گئے، مثلاً ساجن، موہن، پیتم، سنسار، تن من وغیرہ معشوق، صنم، بت، جہان، جان و دل سے کسی طرح کم شگفتہ اور فصیح نہیں، اسی شدت اثر کا نتیجہ تھا کہ بقول صاحب شعر الہند "اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے ایرانی شعرا کے طرز میں کہنا شروع کیا،[1] اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کے ترجمے کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے،[2]

آیندہ اوراق میں اسی دور کے ایک اہم و ممتاز شاعر کے حالات زندگی اور شعری کارناموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے،

---

[1] مولانا عبد السلام ندوی، شعر الہند، جلد اول، ص ۴۰، [2] ایضاً ص ۴۶،

(۲)

حالاتِ زندگی

نام ونسب :-

جان جاں نام، مظہر تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب، علوی نسب، حنفی مذہب،[۱]

میرزا صاحب کا سلسلۂ نسب خود ان کے بیان کے مطابق اٹھائیس واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے،[۲] لیکن اس کے برخلاف مصحفی کہتے ہیں کہ والہ داغستانی نے ریاض الشعرا میں جو یہ لکھا ہے کہ مرزائے مزبور سادات علویہ سے تھے غلط ہے، کیونکہ مرزا صحیح روایت کے مطابق اتراک توران سے ہیں،[۳] دراصل مصحفی کو غلط فہمی ہوئی، اس غلط فہمی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ میرزا صاحب کے جد امجد امیر بابا خاں قاقشال ترکستان کے رہنے والے تھے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ جن کا سلسلۂ نسب انیس واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے، آٹھویں صدی ہجری میں کسی تقریب سے طائف سے

---

[۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۶ [۲] کلمات طیبات، مکتوبات مرزا صاحب، مکتوب اول، ص ۵، [۳] عقد ثریا، ص ۵۵.

ترکستان گئے اور اس علاقے کے ایک حاکم کی لڑکی سے جو قبیلہ قاقشال[1] کا سردار تھا، ان کی شادی ہوگئی، چونکہ اس حاکم کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس لئے اس کی حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی، جب ہمایوں شاہ ایران کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت افاغنۂ غور سے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہندوستان آیا تو اس خاندان کے دو بھائی امیر مجنوں خاں[2] اور امیر بابا خان بھی اس کے ساتھ آئے۔ ماں کی طرف سے ان بھائیوں کا سلسلہ امیر تیمور پر ختم ہوتا ہے، حضرت میرزا جان جاناں مظہرؒ بابا خان کی نسل سے ہیں[3]، خوشگو کا بیان ہے کہ میرزا صاحب مجنوں خاں کی اولاد میں ہیں، جنھوں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تھی[4]، لیکن خود میرزا صاحب کے بیان کے مقابلے میں خوشگو کے بیان کو اہمیت نہیں دی جا سکتی

---

[1] قاقشال ترکی میں لاغر گھوڑے کو کہتے ہیں، خوشگو کا بیان ہے کہ میرزا صاحب بھی کمال فربہی کے باوجود بہت لاغر نظر آتے تھے۔ (سفینۂ خوشگو، ص ۳۰۱) [2] امیر مجنوں خان قاقشال کا شمار اکبر کے عظیم درباریوں میں ہوتا ہے، آئین اکبری میں ان کا نام سہ ہزاری منصب کے امرا کی فہرست میں لکھا ہے، انھوں نے اکبری دور کے متعدد اہم معرکوں میں حصہ لیا۔ خود اکبر کے ساتھ بھی وہ بعض معرکوں میں شریک رہے، ان معرکہ آرائیوں کا حال اکبر نامہ میں پایا جاتا ہے، ایک موقع پر ابوالفضل نے انھیں 'مرد معرکہ دیدۂ تجربہ کار' لکھا ہے، عہد ہمایوں میں وہ نارنول کے جاگیر دار تھے، دور اکبری میں بھی انھیں مختلف اوقات میں مختلف مقامات کی جاگیر اور حکومت حاصل رہی، ان کا انتقال گھوڑا گھاٹ (شمالی بنگال) میں ہوا جو انھیں جاگیر میں ملا تھا، تفصیل کے لئے دیکھئے اکبر نامہ جلد دوم و سوم، مآثر الامرا جلد سوم،

[3] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب مکتوب اول، ص ۱۳

[4] سفینۂ خوشگو، ص ۳۰۱،

دوسرے اس میں تاریخی غلطی بھی ہے، اکبر کے خلاف بغاوت بابا خان نے کی تھی، مجنوں خان کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا،

میرزا صاحب کا مختصر شجرۂ نسب یہ ہے،

میرزا جان جان بن میرزا جان بن میرزا عبد السبحان بن میرزا محمد امان بن شاہ بابا سلطان بن امیر بابا خان بن امیر غلام محمد بن امیر محمد بن خواجہ رستم شاہ بن امیر کمال الدین[1]

امیر بابا خان

امیر بابا خان قاقشال جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہمایوں کے ساتھ ایران سے ہندوستان آئے، اس کی وفات کے بعد وہ دربار اکبری سے متوسل ہوئے، اپنے بھائی مجنوں خاں قاقشال کی طرح سے انھوں نے بھی عہد اکبری کے متعدد اہم معرکوں میں حصہ لیا، یہاں تک کہ خود اکبر کے ساتھ بھی بعض معرکوں میں شرکت کی، ان تمام کا ذکر اکبر نامہ میں موجود ہے، جب بنگال مغلیہ سلطنت کی حدود میں آگیا تو گھوڑا گھاٹ (شمالی بنگال) قاقشالوں کو جاگیر میں ملا، مجنوں خاں قاقشال کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے جباری خان کو وہاں کی سرداری ملی لیکن عملاً بابا خان مالک کل تھے،[2] اکبر نے فوجیوں کے گھوڑوں کے داغنے کا آئین نافذ کیا تو کارندوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور رشوت کا بازار گرم ہو گیا، بابا خان بھی اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ابو الفضل کا بیان ہے کہ بابا خان " بار ہا در دل می سرائید کہ تا حال ہفتاد ہزار روپیہ برسم ارمغانی گذرانده ام و ہنوز صد سوار بداغ نرسیده"[3] آخر انھوں نے بنگال کے بعض دوسرے جاگیرداروں کے ساتھ مل کر اکبر کے چوبیسویں سال جلوس

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۱، [2] شاہ نواز خاں، مآثر الامرا، جلد اول ص ۲۹۱،
[3] اکبر نامہ جلد سوم، ص ۲۹۱ - ۲۹۰،

میں بغاوت کر دی، باغیوں نے کئی بار شاہی فوجوں پر حملہ کیا لیکن ہر بار شکست کھائی اگلے سال پھر انھوں نے شورش کی اور اس بار وہ کامیاب رہے بنگالے کا گورنر مظفر خاں قتل ہوا، باغیوں نے مقبوضات کو آپس میں تقسیم کیا اور ہر ایک نے اپنے لئے لقب اور عہدہ اختیار کیا، بابا خان نے اپنے لئے خان خاناں کا خطاب اور صوبۂ بنگالا کی صوبیداری کا انتخاب کیا[1]، اسی سال ان پر ایک سخت بیماری کا حملہ ہوا جو لاعلاج خورہ میں تبدیل ہوگئی[2] آخر اسی بیماری میں ان کا انتقال ہوا[3]،

مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے بابا خاں کی بغاوت کا ایک نیا سبب بتایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ چونکہ اکبر نے اپنے پچیسویں سال جلوس میں دین اسلام سے انحراف کیا اس لئے بابا خان نے بغاوت کی[4]، ان کا یہ بیان تاریخ کی روشنی میں صحیح قرار نہیں پا سکتا،

بابا خان کی مذکورۂ بالا بغاوت کی پاداش میں اس خاندان کے لئے مناصب عالیہ کے دروازے بند کر دیئے گئے، خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ میرے والد خان مذکور (بابا خان) کے جرم کی وجہ سے جنھوں نے عہد اکبری میں بغاوت کی تھی، عار کم منصبی میں گرفتار تھے[5]، اس لئے شاہ غلام علی کا یہ بیان کہ میرزا صاحب کے آبائے کرام امرائے عظام میں سے تھے، قابل قبول نہیں ہو سکتا[6]، آگے چل کر خود شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اکبر نے اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی کہ اس فرقے کے لوگوں کا منصب اونچا نہ کیا جائے[7]، اسی طرح سے خوشگو کا بھی یہ بیان صحیح نہیں ہو سکتا کہ اس خاندان کے افراد کو سرکار بادشاہی میں ملازمت

---

[1] اکبر نامہ، ص ۲۰۴، [2] ماثر الامرا، جلد اول، ص ۳۹۲، [3] ایضاً، ص ۳۳۰، [4] ماثر الامرا، جلد اول، ص ۳۹۲، [5] بشارت مظہریہ، ق ۱۶ ب، [6] کلمات طیبات مکتوبات مرزا صاحب مکتوب اول، ص ۱۳، [7] مقامات مظہری، ص ۱۴، [8] ایضاً ص ۷، حاشیہ،

نہیں ملتی تھی، البتہ مرزا صاحب کے والد عالمگیر کے دربار میں منصب دار تھے[1] یہ قرین قیاس ہے کہ بغاوت کی پاداش میں اعلیٰ مناصب اس خاندان کے لئے بند کر دیئے گئے ہوں لیکن یہ کہنا کہ حکومت میں کوئی عہدہ ہی نہ ملتا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ سلاطین گورگانیہ کی خدمت و رفاقت اس خاندان کے لوگوں کا شعار تھا،[2]

صاحب معمولات مظہریہ کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کے بڑے دادا مرزا محمد امان کی شادی اکبر بادشاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی، اس طرح سے ان کے دادا (مرزا عبد السبحان) تیموری خاندان کے نواسے ہوتے ہیں،[3] شاہ غلام علی نے دو واسطوں سے انھیں اکبر کا نواسہ ہونا بتایا ہے[4] چونکہ مولوی نعیم اللہ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مرزا محمد امان کی شادی اکبر کی لڑکی سے ہوئی تھی، اس لئے انھیں کے بیان کو ترجیح دی جائے گی، لیکن اس بیان کی تصدیق تاریخ یا کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی،

مرزا عبد السبحان منصب شاہی پر فائز ہونے کے باوجود تصوف کی طرف عملاً مائل تھے اور طریقۂ چشتیہ میں لوگوں کو مرید کرتے تھے، ان کی ماتحتی میں جتنے سپاہی، سوار اور خدمتگار تھے، سب تہجد گذار تھے،[5]

مرزا صاحب کی دادی نواب اسد خاں عالمگیر شاہی[6] کی خالہ زاد بہن تھیں، وہ شیعہ

---

[1] مقامات مظہری ص ۱۰، [2] آزاد بلگرامی، سرو آزاد ص ۲۲۱، [3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی کتاب بشارات مظہریہ ص ۴۴، [4] مقامات مظہری ص ۱۴، [5] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، کتاب بشارات مظہریہ ص ۴۴، [6] محمد ابراہیم نام تھا، اسد خاں خطاب شاہجہانی دربار سے ملا تھا، عہد عالمگیری میں منصب وزارت پر فائز ہوئے، بہادر شاہ اول کے عہد میں وکیل مطلق ہونے کا اعزاز ملا اور نظام الملک آصف الدولہ خطاب عطا ہوا فرخ سیر نے اس غلط فہمی کی بنا پر کہ انھوں نے جہاندار شاہ کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی ان کے لڑکے ذوالفقار خاں کو قتل کرا دیا اور خود ان کو قید میں رکھا اور ان کا گھر اور جائداد ضبط کر لی، اسی حالت قید میں

تھیں، لیکن شوہر کے فیض تربیت سے سنی ہو گئی تھیں، اس قدر عبادت گذار تھیں اور ان کی صفائی باطن اتنی بڑھ گئی تھی کہ تسبیح جمادات سن سکتی تھیں، وہ عورتوں کو مثنوی مولانا روم کا درس بھی دیتی تھیں۔[۵]

والدہ، شیخ زادہ ہای بیجاپور کے عالی خاندان سے تھیں، وہ بہت نیک، پارسا اور عبادت گذار تھیں، اور جود و سخا میں تو اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں۔[۶]

میرزا جان۔

والد بزرگوار کا نام میرزا جان تھا، مولوی نعیم اللہ کا بیان ہے کہ وہ خوبان روزگار میں سے تھے، سلاطین و امراان کے عادات و اطوار کو سند و حجت مانتے تھے، عالمگیر کے لشکر میں صرف چند اشخاص اس بلند مرتبے کے تھے اور میرزا جان ان سب کے مقتدا اور پیشوا تھے، وہ جملہ علوم و فنون میں ماہر و باہر تھے، اور کشتی اور تیر اندازی میں خصوصاً اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔[۷] ان کے علمی فضل و کمال کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رح فرماتے تھے کہ میرزا محمد زاہد[۸] کہا کرتے تھے کہ "تقریر میرزا جان جان من است"۔[۹]

(حاشیہ ص ۲۶ کا) ۱۱۲۹ھ میں چونوے سال کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا، وہ صاحب جاہ و اقتدار ہونے کے ساتھ ساتھ صفات حمیدہ اور مکارم اخلاق کے لحاظ سے بھی بہت بلند مرتبہ تھے، صاحب سیر المتاخرین نے انھیں ہندوستان کا خاتم الامرا کہا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے ماثر الامرا، جلد اول، سیر المتاخرین جلد دوم، [۵] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، کتاب مذکور، ص ۱۴۔

[۶] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۴، [۷] ایضاً بشارات مظہریہ، ق ۱۸، [۸] عہد عالمگیری کے بہت بڑے عالم تھے، کلام و حکمت اور منطق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، [۹] مناظر احسن گیلانی تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ، ص ۱۸۴،

میرزا جان کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا، وہ جانی تخلص کرتے تھے، لیکن ان کا کلام کسی تذکرے یا کتاب میں نہ مل سکا، صرف مندرجۂ ذیل دو شعر میرزا مظہر کے انتخاب خریطۂ جواہر میں ملتے ہیں،[1]

چوں من کسے بکام دل روزگار نیست | نی صبر و نی قرار و نی امید وصل یار
آں نیز رفتہ رفتہ بہ پہلوی ما نشست | خوں شد دل خدنگ تو تا از تو درد مند

میرزا جان حضرت شاہ عبد الرحمٰن قادری کے مرید تھے[2]، شاہ صاحب کا مزار شاہجہان آباد میں لاہوری دروازہ اور کابلی دروازہ کے درمیان واقع ہے، اس زمانے میں اس علاقے کو مسجد پری کہتے ہیں[3]،

میرزا جان اورنگ زیب کے دربار سے توسل رکھتے تھے، مولوی نعیم اللہ بہرائچی کی اوپر کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذمے لشکر کی کوئی خدمت تھی، خلیل الشہر ندی نے بھی لکھا ہے کہ "درجرگہ عساکر بودند"[3]، گارساں دتاسی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ عہدۂ قضا پر فائز تھے[4]، وہ اورنگ زیب سے ناراض ہو کر اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے، ان کی ناراضگی اور استعفے کا سبب مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے جو حسب ذیل ہے،

"جس زمانہ میں اورنگ زیب ممالک دکن کی تسخیر کی طرف متوجہ تھا، صوبہ دار ارکاٹ نے بغاوت کی، بادشاہ بہت پریشان ہوا، چونکہ صوبہ دار ارکاٹ اور میرزا جان میں بڑی محبت اور یگانگت تھی، اس لئے ارکان دولت نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ میرزا جان کو

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۱، [2] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۷، حاشیہ، [3] تراجم المشائخ، [4] تاریخ ادبیات ہندوستانی (فرانسیسی) جلد دوم، ص، ۲۹،

صوبہ دار ارکاٹ کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ اسے سمجھا کر بادشاہ کی اطاعت پر راضی کریں بادشاہ نے میرزا جان کو اس کام پر متعین کیا، انھوں نے صوبہ دار کو بادشاہ کی اطاعت پر آمادہ کر لیا اور اس کی طرف سے ایک خطیر رقم بطریق پیش کش اور بہت سے تحائف بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے، جو تحائف، جواہر وغیرہ خود انھیں ملے تھے، ان میں سے کچھ نہ لیا، بادشاہ بہت خوش ہوا اور ان سے کہا کہ اگر تمھاری کوئی خواہش ہو تو کہو وہ پوری کی جائے گی، انھوں نے کہا کہ میں ایک مدت سے اپنے منصب میں ترقی کا امیدوار ہوں، بادشاہ نے کہا کہ اگر اس کے علاوہ کچھ چاہتے ہو تو کہو، انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں چاہتا، بادشاہ کو غصہ آگیا، اس نے کہا کہ تمھیں اپنے اجداد کی نمک حرامی یاد نہیں ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نمک حرامی اور جانفشانی دونوں یاد ہیں، ان ہی لوگوں کی جانفشانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کا تخت آپ کے تصرف میں ہے، بادشاہ نے کہا کہ خلد مکان نے مجھے چند وصیتیں کی تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ تمھارے خاندان کے کسی فرد کو اعلیٰ منصب نہ دیا جائے، میرزا جان نے کہا، تو پھر میں بھی آپ کی خدمت سے دست بردار ہوتا ہوں، چنانچہ انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور اکبر آباد آکر ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔[1]

اس بیان میں دو تاریخی غلطیاں ہیں، ایک تو یہ کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ارکاٹ صوبہ نہیں تھا، اس لیے صوبہ دار ارکاٹ کی بغاوت بے بنیاد ثابت ہوتی ہے یہ ممکن ہے کہ کسی اور حاکم نے بغاوت کی ہو، دوسری غلطی یہ ہے کہ خلد مکان خود اورنگ زیب کو کہتے ہیں،

میرزا جان نے اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر دنیاوی امور سے کنارہ کشی اختیار

---

[1] مولوی نعیم اللہ، بشارات مظہریہ، ق ۱۸،

کرلی اور اپنے مال و دولت کا بڑا حصہ راہ خدا میں فقرا میں تقسیم کر دیا، پچیس ہزار روپے لڑکی کی شادی کے لئے رکھ چھوڑے تھے، ایک دن سنا کہ ایک دوست مالی مشکلات میں گرفتار ہیں، پوری رقم ان کے حوالے کر دی۔[۱]

میرزا جان کا توکل بہت بڑھا ہوا تھا، ایک بار گھر میں کدو کی بیل لگائی تھی، ایک دن لونڈی نے کہا کہ آپ نے توکل کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی گھر میں کدو کی بیل لگائی ہے، ممکن ہے کہ فاقے کی حالت میں یہ خیال گذرے کہ اس کے پھل اور پتوں سے پیٹ بھر لوں، انھوں نے فوراً بیل کو اکھڑوا دیا۔[۲]

شاہ غلام علیؒ کے ان بیانات کے مقابلے میں مصحفی کا یہ بیان صحیح نہیں ہو سکتا کہ والد کی وفات کے بعد میرزا مظہرؒ کو مال و اسباب فراواں، حاصل ہوا جسے انھوں نے دعوتِ یاران میں صرف کیا اور اٹھارہ سال کی عمر میں کلاہ درویشی سر پر اوڑھ لی۔[۳]

میرزا جان نے ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی۔[۴]

میرزا جان جاناں ـــ

سال ولادت: میرزا جان اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر اپنے علائق کے ساتھ دکن سے آگرہ جا رہے تھے تو میرزا مظہرؒ کالا باغ میں جو حدود مالوا میں واقع ہے، ۱۱ رمضان المبارک شب جمعہ پیدا ہوئے۔[۵] صاحب مخزن الغرائب کا بیان ہے کہ میرزا صاحب اکبرآباد میں پیدا ہوئے، لیکن اس بیان کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی، میرزا صاحب کا سال ولادت عام طور پر تذکروں میں ۱۱۱۱ھ ملتا ہے، تذکرۂ بے نظیر نے ۱۱۱۳ھ دیا ہے،[۶] معمولات مظہریہ اور

---

[۱] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۴، [۲] ایضاً ص ۱۴، [۳] عقد ثریا ص ۵۵، [۴] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ۱، ص ۱۲، [۵] مولوی نعیم اللہ بہرائچی معمولات مظہریہ ص ۱۰، [۶] عبدالوہاب دولت آبادی کتاب مذکور، ص ۱۱۶

مقامات مظہری خاص میرزا صاحب کے حالات میں لکھی گئی ہیں اور دونوں کے لکھنے والے میرزا صاحب کے مرید ہیں، صاحب معمولات نے ۱۱۱۱ھ اور صاحب مقامات نے ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ سال ولادت لکھا ہے، صاحب مقامات نے تاریخ پیدایش کے یہ دو مادے بھی دیئے ہیں،

(۱) تولد صاحب شرع،

(۲) طلوع شمس الملت والدین،

ان دونوں مادّوں سے ۱۱۱۱ھ نکلتا ہے، لیکن یہ تاریخ کسی قدر مشکوک ہے اور خود میرزا صاحب کے مختلف بیانات نے ان کے سال ولادت کے متعلق اختلاف پیدا کردیا ہے، میرزا صاحب نے اپنے سال پیدائش کا ذکر تین موقعوں پر کیا ہے،

(۱) غلام علی آزاد بلگرامی کی استدعا پر جب اپنے حالات ان کی تصنیف سروآزاد کے لئے لکھ کر بھیجے ہیں تو اس میں لکھا ہے کہ "در عشرۂ اولیٰ مایۃ ثانیہ بعد الف ولادتش (ولادت میرزا صاحب) اتفاق افتاد"[1] اس بیان کے مطابق ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ سے پہلے ہونا چاہئے،

(۲) اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ "امروز کہ ہزار و صد و ہفتاد ہجری است و عمر بشصت رسیدہ" اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو ان کا سال ولادت ۱۱۱۰ھ یا ۱۱۱۱ھ قرار پاتا ہے،

(۳) ایک مرید کے اصرار پر اپنے مختصر حالات اس کو لکھ کر بھیجے ہیں، اس میں اپنا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ لکھتے ہیں، خود میرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں "در ہزار و صد و سیزدہ ولادت

---

[1] آزاد بلگرامی، سرو آزاد، ص ۲۳۱،

فقیر اتفاق افتاد[1]۔ اسی مکتوب میں اپنے والد ماجد کے سال وفات کے متعلق لکھتے ہیں کہ "در سال ہزار و صد وسی ہجری انتقال زیں عالم فرمودہ.... در عمر شانزدہ سالگی گرد یتیمی برروئے نشست[2]"۔ میرزا صاحب کے والد کا انتقال ۱۱۳۰ھ میں ہوتا ہے اور میرزا صاحب کی عمر اس وقت سولہ[3] سال کی ہے، تمام تذکرے ان کی اس عمر کے بارے میں متفق ہیں اس لئے اگر اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ان کا سال پیدائش ۱۱۱۳ھ زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے،

صاحب معمولات مظہریہ نے اس اختلاف تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور پھر نہایت وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ میرزا صاحب کا سال ولادت ۱۱۱۱ھ ہے، نہ کہ ۱۱۱۳ھ لیکن انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی،

نام :-

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ

"آئین سلطنت تھا کہ امرا کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں، بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پسند کر دیں، کسی کو خود بھی بیٹا بیٹی کر لیتے تھے یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد او رمحبت پیدا کرتے تھے، ان کے لئے ایک وقت پر سند ترقی ہوتے تھے اور بادشاہوں کو ان سے وفاداری اور جان نثاری کی امیدیں ہوتی تھیں[4]"

چونکہ میرزا مظہر کے والد بزرگوار بھی ملازمین شاہی میں داخل تھے (گو ان کی پیدائش کے وقت وہ مستعفی ہو چکے تھے) اس لئے جب وہ پیدا ہوئے تو اورنگ زیب کو خبر بھیجی گئی، اس نے کہا

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات مرزا صاحب، مکتوب اول، ص ۱۳، [2] ایضاً، [3] ص ۱۳۰،

چونکہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اور اس بچے کے باپ کا نام میرزا جان ہے اس لئے اس کا نام ہم نے جان جان رکھا[۱]، لوگوں نے بڑھا کر جان جاناں بنا دیا، یہ تغیر خود میرزا صاحب کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ خود انھوں نے اپنے مکاتیب میں اپنا نام ہمیشہ جان جاناں لکھا ہے، سراج الدین علی خان آرزو میرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کا بیان ہے کہ انکی (میرزا صاحب) زبان سے یہی سنا گیا کہ ان کا اصلی نام جان جاں ہے، لیکن اب جان جاناں مشہور ہو گیا ہے[۲]، مگر انھوں نے جو وجہ تسمیہ بتائی ہے وہ مولوی نعیم اللہ کی بتائی ہوئی وجہ تسمیہ سے الگ ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد کا نام محمد جان تھا، اس لئے انھوں نے بیٹے کا نام جان جاں رکھا[۳]، اسی طرح سے میر تقی میر کا بیان ہے کہ ان کے والد کا نام مرزا جان تھا، وہ بیٹے کو فرط محبت سے جان جان کہا کرتے تھے اور بالآخر وہ اسی نام سے مشہور ہوئے[۴]، یہ دونوں بیانات صحیح نہیں، جان جاں نام رکھنے کی اصل وجہ وہی ہے جو صاحب معمولات مظہریہ نے بتائی ہے، اس سلسلے میں مصحفی کا بیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن انھوں نے (میرزا صاحب) اپنی وجہ تسمیہ میرے سامنے یہ بیان کی کہ میرے والد کا نام میرزا جان تھا، میں خلد مکان کے آخری زمانہ میں پیدا ہوا جب انھیں اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے فرمایا کہ اس بچے کا نام جان جاں رکھا جائے[۵]،

آزاد بلگرامی جو میرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کے نام اور تخلص کے سلسلے میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ان میرزا صاحب کا نام اور تخلص گویا ترجمان اسرار قیومی مولانا رومی کا عطیہ ہے، انھوں نے پانسو سال پہلے مثنوی کے دفتر ششم میں فرمایا تھا،

---

[۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۶ [۲] مجمع النفائس قلمی [۳] ایضاً [۴] نکات الشعراء ص ۵ [۵] عقد ثریا، ص ۵۵

جانِ اول مظہر درگاہ شد　　　جان جاں خود مظہر اللہ شد[۱]

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ان کا نام زبانوں پر جان جاناں چڑھ گیا،[۲]

خود میرزا صاحب نے بھی اپنے نام کی نہایت لطیف شاعرانہ توجیہ کی ہے، فرماتے ہیں،

زتاثیر محبت در دلش کردیم جا منظر　　　بجا باشد اگر خوانند یاراں جان جاں مارا

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے اپنے طور پر ان کا نام شمس الدین رکھا تھا، لیکن وہ عالم گیری نام کے سامنے چمک نہ سکا،[۳] مگر اس کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس معمولات مظہریہ میں جو میرزا صاحب کے ایک مرید کی لکھی ہوئی کتاب ہے، شمس الدین، حبیب اللہ لقب بتایا گیا ہے،[۴]

وطن

میرزا صاحب کے والد میرزا جان کا وطن شہر آگرہ تھا،[۵] چنانچہ میرزا صاحب کی نشو ونما اور ابتدائی تعلیم و تربیت اکبرآباد ہی میں ہوئی،[۶] لیکن خود میرزا صاحب نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا اور یہیں ان کی تربیت باطنی ہوئی،[۷] مگر کسی کتاب یا تذکرے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دہلی کب اور کن محرکات کی بنا پر گئے، دہلی میں ان کی خانقاہ جامع مسجد کے قریب کوچۂ امام میں تھی،[۸] انشا کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جامع مسجد کے متصل ایک بالاخانے پر رہتے تھے، جو ان کے لئے کیول رام بانیہ نے بنوایا تھا،[۹]

---

[۱] سرد آزاد، ص ۲۳۱، [۲] ایضاً، [۳] آب حیات، ص ۱۳۰، [۴] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۶، [۵] میر تقی میر نکات الشعرا، ص ۵، [۶] آزاد بلگرامی، سرد آزاد، ص ۲۳۱، [۷] ایضاً [۸] محمد سرور، عمدۂ منتخبہ، قلمی [۹] انشا، دریائے لطافت، اردو ترجمہ از پنڈت کیفی، ص ۲۷،

تعلیم و تربیت:

میرزا صاحب ابھی بہت چھوٹے ہی تھے کہ ان کے عالم و علم دوست والد نے ان کی تعلیم کا اہتمام کیا، وہ چاہتے تھے کہ ان کے جان جاں کا کوئی لمحہ ضائع نہ جائے، اس لئے ہمیشہ بیٹے کو تاکید کرتے کہ جان بدر وقت اور عمر کا کوئی نعم البدل نہیں اس لئے ان کو ضائع نہ کرنا چاہیے[1] چنانچہ رسائل محاورۂ فارسی وغیرہ میرزا صاحب نے خود اپنے والد سے پڑھے اور معقول و منقول کی کتابیں بعض علمائے وقت سے پڑھیں، کلام اللہ قاری عبدالرسول دہلوی تلمیذ شیخ القراء شیخ عبدالخالق سے پڑھا اور علم تجوید و قرأت کی سند بھی انھیں سے لی، والد کی وفات کے بعد علم حدیث و تفسیر اور دوسری مبسوط کتابیں حضرت حاجی محمد افضل سیالکوٹی تلمیذ شیخ المحدثین شیخ عبداللہ سالم مکی سے پڑھیں[2]

میرزا صاحب کے والد ماجد ان کو اکثر یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ قرآن مجید اور احادیث کو سمجھنے کے لئے محاورات عرب سے واقفیت لازمی ہے، اسی طرح اس دیار کے محاورات سے بھی واقفیت ضروری ہے، تاکہ مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دانش مندوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے[3]

میرزا صاحب کے والد نے بقول خود میرزا صاحب بوقت مرگ انھیں یہ وصیت کی تھی کہ اپنے اوقات کو کسب کمالات میں صرف کرنا اور اپنی زندگی کو غیر ضروری اشغال میں ضائع نہ کرنا[4] اس کے بعد میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی وصیت کی برکت سے میں نے اپنے اوقات کو علم و عمل و صحبت احباب، پر تقسیم کر رکھا ہے اور اپنی زندگی

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۵ [2] ایضاً، ص ۸ [3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۴ [4] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۸،

سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔[۱]

میرزا صاحب کی تحصیلِ علوم کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود میرزا صاحب کے بیانات پر مبنی ہے اور اس کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، ان کے بعض معاصرین کے بیانات بھی اس کی تائید کرتے ہیں، مثلاً احمد علی سندیلوی لکھتے ہیں کہ انھوں نے صغر سنی ہی میں صرف و نحو اور معقول و حدیث و تفسیر و عروض و قافیہ، تلخیص المفتاح کا کچھ حصہ پڑھ لیا تھا اور وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے،[۲] فتح علی گردیزی کا بیان ہے کہ وہ فقہ و حدیث، سیر و تواریخ وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے،[۳] صاحب تذکرۂ مسرت افزا کہتے ہیں کہ وہ کافی علوم و فنون میں درک رکھتے تھے اور خصوصاً حدیث و معرفت، سلوک و توحید میں بے نظیر تھے۔[۴]

مذکورۂ بالا حقائق کی روشنی میں مولانا محمد حسین آزاد کے اس بیان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ "مرزا صاحب کی تعلیم عالمانہ نہ تھی مگر علم حدیث یا اصول پڑھا تھا۔"[۵]

درسی اور متداول علوم کے علاوہ آداب بادشاہی، فن سپہ گری اور دوسرے متداول فنون کی بھی میرزا صاحب کو تعلیم دی گئی تھی، کیونکہ ان کے والد کا قول تھا کہ اگر تم امیر ہو گے تو ارباب ہنر کی قدر کرو گے، اور اگر میری خواہش کے مطابق فقر و ترک اختیار کرو گے تو اہل ہنر کے محتاج نہ رہو گے، چنانچہ میرزا صاحب نے ہر ہنر میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ لوگ ان سے اپنے اپنے ہنر کی داد مانگتے اور ان کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے، جو صاحب ہنر ان سے ملا اپنے فن میں ان کی استادی کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکا۔[۶]

---

۱ شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۸، ۲ مخزن الغرائب قلمی ۳ تذکرہ ریختہ گویان ص ۱۳، ۴ ابو الحسن امیر احمد تذکرۂ مسرت افزا، بحوالہ معاصر پٹنہ، جلد ۲ حصہ ۸، ۵ آب حیات، ص ۱۲۰، ۶ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۵،

استعمال اسلحہ میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر بیس آدمی تلوار سے مجھ پر حملہ کریں اور میرے ہاتھ میں صرف ایک لکڑی ہو تو ان شاء اللہ کوئی مجھے زخمی نہیں کر سکتا۔[1] ان کا یہ بھی بیان ہے کہ میں نے چودہ سال بانک اور پٹے کا فن حاصل کیا اور اس میں مہارت بہم پہنچائی، اگرچہ یہ فن فقیروں اور درویشوں کے شایانِ شان نہیں اگر اسے حفاظت نفس کی خاطر حاصل کیا جائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں، چنانچہ اس فن کی بدولت میں ہمیشہ گزند سے محفوظ رہا، مگر میں نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔[2]

ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، جب انھوں نے سلام پھیرا تو ابر کی تاریکی میں کسی شخص نے ان پر خنجر سے وار کرنا چاہا، اتفاق سے بجلی چمکی اور انھوں نے اس کی روشنی میں خنجر کو دیکھ لیا اور اس کے ہاتھ سے چھین کر پھر اس کو دے دیا، اس نے دوبارہ حملہ کرنا چاہا، انھوں نے پھر خنجر چھین لیا اور اس کو دے دیا، اس نے سات بار حملہ کرنے کی کوشش کی اور ساتویں بار میرزا صاحب نے خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا، آخر وہ قدموں پر گر پڑا اور معافی کا خواستگار ہوا۔[3]

ایک بار گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں سامنے سے ایک مست ہاتھی آ رہا تھا، ہاتھی نے قریب پہنچ کر ان کو سونڈ میں لپیٹ لیا، انھوں نے خنجر نکالا اور ہاتھی کی سونڈ پر اس زور سے مارا کہ اس نے بے تاب ہو کر ان کو چھوڑ دیا اور یہ صحیح سلامت بچ آئے۔[4]

ایک بار میرزا صاحب نے جہاد میں شرکت کی اور عین معرکے کے درمیان ایک

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۱۵۔ [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ ق ۶ ب۔ [3] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۵۔ [4] ایضاً۔

غزل لکھی جس کو شیخ سرفراز علی خاں نے جو لشکر اسلام کے امیر تھے، بہت پسند کیا اور ان کی جرأت و شجاعت کی داد دی اور کہا کہ شجاعت عبارت ہے معرکے کے وقت اجتماع حواس و ثبات قدم سے، غزل مذکور کا مطلع تھا،

این فتح را بنام نگاہت نوشتہ ایم
دل را ہلاک چشم سیاہت نوشتہ ایم[۱]

یہ غزل میرزا صاحب کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے،

مقامات مظہری میں بھی مختصراً اس جہاد اور غزل کا ذکر ہے اور خود میرزا صاحب کی زبان سے ہے، اس سے نہ صرف مندرجۂ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غزل کہنے کا محرک کیا تھا، انھوں نے فرمایا کہ ایک بار میں جہاد میں شریک ہوا، تیروں کی بوچھار اور نیزوں کے وار ہو رہے تھے، میرے پاس والے ہاتھی پر جو سردار بیٹھا تھا اسے شک گذرا کہ مجھ پر خوف طاری ہے، میں نے اسی وقت ایک غزل کہی وہ اس پر متعجب ہوا،[۲]

میرزا صاحب علم موسیقی سے بھی واقف تھے، ماہرین فن ان کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے حاضر ہوتے تھے،[۳]

وہ کھانا پکانا بھی خوب جانتے تھے، عالم جوانی میں جب وہ عزلت نشین نہیں ہوئے تھے، ان کے دوست احباب بطریق ضیافت یا کسی نئی عمارت یا خانہ باغ کی تیاری کے سلسلے میں انھیں مدعو کرتے اور طرح طرح کے کھانے پکواتے اور ان سے داد کے طالب ہوتے، جو کھانے انھیں پسند آتے ان کی وہ داد دیتے،[۴]

۱؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ ق ۱۰ ب ۲؎ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۶
۳؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ، ق ۲۳ ب ۴؎ ایضاً ق ۱۹

میرزا صاحب کپڑا قطع کرنا بھی خوب جانتے تھے، خصوصاً شلوار پچاس طریقوں سے قطع کر سکتے تھے،[1]

تربیت باطنی:

خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ والد کی وفات کے بعد میرے چند خیر خواہوں نے چاہا کہ دربار میں میرا موروثی منصب مجھے مل جائے، ایک دن کچھ لوگ سفارش کی غرض سے مجھے فرخ سیر کے پاس لے گئے، اتفاق سے بادشاہ کو زکام ہو گیا تھا، اور وہ اس دن دربار میں نہ آسکا، اس لئے مایوس لوٹنا پڑا، اسی رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک بزرگ کے مزار پر گیا ہوں، صاحب مزار قبر سے باہر آئے اور اپنی ٹوپی (طاقی) میرے سر پر رکھی، وہ بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین تھے، اس خواب کے بعد میرے دل سے منصب وجاہ کی رغبت جاتی رہی، اور درویشوں کی زیارت کا سودا سر میں سمایا جہاں کہیں کسی صاحب کمال کی خبر ملتی میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوتا چنانچہ شیخ کلیم اللہ چشتی، شاہ غلام محمد موحد، میر ہاشم جالیسری وغیرہ کی خدمت میں میں نے اسی زمانے میں حاضری دی،[2] میرزا صاحب کے اس واضح بیان کے مقابلے میں خلیل السہرندی کا یہ کہنا کہ "چند مدت ایشاں ہم بمنصب پدر سرگرم بودند"[3] بے بنیاد ثابت ہوتا ہے،

ان دنوں دہلی میں جن صوفیائے کرام کا فیض جاری تھا اُن میں ایک شخصیت حضرت سید نور محمد بدایونی کی بھی تھی،[4] ایک دن میرزا صاحب اپنے گھر پر بیٹھے تھے، بزرگ

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۱۹ - ۱۸ [3] تراجم المشائخ المذکورین فی ما سلسلة المجددیہ [4] حضرت سید نور محمد بدایونی نے کسب مقامات سلوک حضرت شیخ سیف الدین فرزند و خلیفہ عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم فرزند و سجادہ نشین حضرت مجدد الف ثانی سے کیا تھا وہ علوم ظاہر و باطن

احباب بھی تھا اور سامان طرب بھی، اتفاقاً کسی نے حضرت سید کا ذکر کیا اور ان کے اوصافِ حمیدہ بیان کئے، میرزا صاحب حاضرین مجلس کے منع کرنے کے باوجود اسی وقت آستاں بوسی کے لئے روانہ ہو گئے، حضرت سید کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی ان کی خدمت میں مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوتا تو اس کی صلاحیت و استعداد معلوم کرتے اور استخارۂ مسنون کے بعد مرید کرتے، لیکن میرزا صاحب کو انھوں نے اسی وقت ذکر طریقۂ عالیہ بتایا، ان سے کہا کہ آنکھیں بند کر لو اور اپنے قلب کی طرف متوجہ ہو اور خود توجہ دینی شروع کی، اور ایک ہی توجہ میں لطائف خمسہ[1] جاری کر کے انھیں رخصت کیا[2]۔

میرزا صاحب کا حضرت سید نور محمد بدایونی کی خدمت میں حاضر ہونا حقیقۃً محض ایک اتفاقی بات نہ تھی، عشق ایزدی ان کے خمیر میں موجود تھا اور بچپن ہی سے ان کے والد نے ان کی تربیت باطنی کا خیال رکھا تھا، وہ میرزا صاحب کو ہمیشہ یہ نصیحت کیا کرتے تھے؛

(حاشیہ ص ۳۹): دونوں میں باکمال تھے، ان کا استغراق اور قوت جذب بہت بڑھی ہوئی تھی، انھوں نے پندرہ سال مستی و مدہوشی میں گذارے صرف نماز کے وقت وہ ہوش میں آتے تھے، وہ سنت نبوی کا اتباع بہت سختی سے کرتے تھے، کتب سیر و اخلاق نبوی کا مطالعہ اکثر فرماتے اور ان پر عمل کرتے، اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے، سخت بھوک کی حالت میں تھوڑا سا کھاتے اور پھر مراقبے میں چلے جاتے، مراقبہ کی کثرت کی وجہ سے پیٹھ خم ہو گئی تھی، میرزا صاحب کو ان سے غایت درجہ محبت تھی، ان کا نام زبان پر آتے ہی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، انھوں نے ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۳۵ھ کو انتقال فرمایا (شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۰۸)، مزار شریف بیرون کوٹلہ سلطان المشائخ (دہلی) میں ہے (مولوی نعیم اللہ، معمولات مظہریہ، ص ۱۵۹)۔

[1] لطائف خمسہ یہ ہیں، ۱ لطیفۂ نفس ۲ لطیفۂ قلب، ۳ لطیفۂ روح، ۴ لطیفۂ خفی، ۵ لطیفۂ اخفیٰ، [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۲، ۱۵

"ہر کہ دلش بداغِ عشق برشتہ نمی شود خاشاک طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد زمین طینت او صلاحیت تخم محبت الٰہی ندارد زیرا کہ عشق مجازی زینۂ عشق حقیقت پس ما و امیکہ رشتۂ عشق مجازی طوق گلو کردہ در کوچہ و بازار رسوا و خوار نسازید روح فقیر از شما راضی نخواہد شد، اما از غیر وسیلہ امری دریں راہ منظور نباشد، چوں بوسیلۂ ایں دولت راہی بمطلب کشادہ گردد جاں بازی در راہ مولیٰ کہ بادشاہ پادشاہان عشوقان اعلیٰ و ادنیٰ است اختیار باید نمود کہ سعادت جاودانی مربوط باں است"[1]

خاندانی روایات، باپ کی تربیت اور عملی نمونے نے ان کی زمین طینت کو زرخیز بنا دیا تھا، صرف چند چھینٹوں کی ضرورت تھی، اس کا بھی غیب سے سامان پیدا ہو گیا، مختصر یہ کہ اٹھارہ سال کی عمر میں میرزا صاحب حضرت سید نور محمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ مریدین میں داخل ہوئے اور طریقۂ نقشبندیہ پر عمل کرنے لگے، چار سال ان کی خدمت میں رہنے کے بعد انھوں نے ولایت کبریٰ و خرقہ و اجازتِ مطلقہ حاصل کی[2]۔

میرزا صاحب کا شجرۂ طریقت یہ ہے،

میرزا جان جاناںؒ، سید نور محمد بدایونیؒ، شیخ سیف الدینؒ، شیخ محمد معصوم ملقب بہ عروۃ الوثقیٰ، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، خواجہ عبد الباقی باللہ، خواجہ محمدؒ، درویش محمدؒ، مولانا محمد زاہدؒ، خواجہ عبید اللہ احرارؒ، خواجہ یعقوب چرخیؒ، خواجہ علاء الدین عطار، خواجہ بہاء الدین محمد نقشبند رحمۃ اللہ علیہ[3]

حضرت سید نور محمد بدایونیؒ نے ۱۱۳۵ھ میں انتقال فرمایا، لیکن میرزا صاحب نے اب بھی اس آستانے کو نہ چھوڑا، چھ سال تک ان کے مزار کی مجاوری کی، اور روحانی طریق

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۱، [2] ایضاً ص ۱۵، [3] ایضاً، ص ۱۵۹،

ادسیت کسبِ ولایت علیا کرتے رہے[1] شیخ علی کشمیری شیخ العرب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شیخ محمد صدیق سرہندی نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانی کے خلفائے اجل میں سے تھے، اس بشارت کی شہادت دی تھی[2] ایک رات میرزا صاحب نے اپنے مرشد کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں کہ مقصود حق ہے اور وہ غیر متناہی ہے، اس لئے اپنی مدد دعمر کو اس کی طلب میں صرف کرنا چاہئے اور مقصود کو حاصل کرنا چاہیے[3]

اس خواب کے بعد میرزا صاحب حضرت حاجیؒ[4] کی خدمت میں پہونچے، انھوں نے فرمایا کہ تم نے تو حضرت سید (نور محمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ) سے نہایت بصیرت کے ساتھ کسب سلوک کیا ہے اور مجھ میں قوت کشفی اتنی نہیں ہے، چنانچہ ان سے میرزا صاحب نے صرف حدیث پڑھی، لیکن خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ اثنائے سبق میں فیض باطن بھی مجھکو

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۵، [2] ایضاً، [3] ایضاً ص ۱۶، [4] حاجی محمد افضل سیالکوٹی عالم متبحر و فاضل و دانشور تھے، اور اسرار علوم باطن کے آشنائے کامل حجۃ اللہ نقشبندیہ فرزند و خلیفہ حضرت محمد معصوم سے دس سال تک استفادۂ فیوض باطنی کیا تھا، بارہ سال تک حضرت شیخ عبد الاحد فرزند و خلیفۂ شیخ محمد سعید فرزند و سجادہ نشین حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کئے تھے، علوم معقول و منقول بھی انھیں سے حاصل کئے تھے، اور سند حدیث بھی انھیں سے لی تھی، شیخ سالم بصری ثم المکی سے بھی سند حدیث لی تھی، حاجی صاحب کا استغراق بہت قوی تھا اور وہ فنا و نیستی کے نشہ سے ہر وقت بیخود رہا کرتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان سے سند حدیث لی تھی، حاجی صاحب کو کتابوں سے بہت شغف تھا، نقد کی صورت میں جو ہدیہ ملتا اس کی کتابیں خرید لیتے اور وقف کر دیتے، ایک بار کہیں سے پندرہ ہزار روپئے آئے، انھوں نے پوری رقم کی کتابیں خرید لیں اور حسب معمول وقف کر دیں، (شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۹۵) حاجی صاحب نے ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی، (غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۶۴) مزار شریف حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار کے متصل ہے،

ضرور پہنچا تھا،[1]

حاجی صاحب کی وفات (۱۱۲۶ھ) کے بعد میرزا صاحب حضرت شاہ گلشن[2] رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے حاضر ہوئے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو حضرت محمد زبیر[3] قدس سرہ کے سپرد کر دیا ہے، اس لئے میرزا صاحب ان کی خدمت میں پہونچے، شاہ غلام علی کا بیان کسی قدر مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ شاہ گلشن نے میرزا صاحب سے کہا کہ فقیر آداب طریقہ کا چنداں پابند نہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ تم استقامت کے لئے کہیں اور جاؤ، چنانچہ میرزا صاحب حضرت زبیر کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے کہا کہ تم کو حضرت سید سے نسبت صحیحہ مل چکی ہے، اسی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اس کا ثمرہ تم خود دیکھو گے. اس لئے میرزا صاحب حضرت حافظ سعد اللہ[4] کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۰، [2] حضرت شاہ گلشن حضرت شیخ عبدالاحد نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ تھے، علوم ظاہری و باطنی اور زہد و ورع میں انہیں کمال حاصل تھا، تین تین دن پر کھانا کھاتے، تیس سال ایک ہی کمل میں گذار دیئے، جامع مسجد دہلی میں سکونت تھی، جب پیاس لگتی تو مسجد کے حوض میں سے دو تین چلو پانی جو اکثر گرم ہوتا پی لیتے، ۱۱۵۰ھ میں انتقال فرمایا (غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول ص ۶۷۲) [3] حضرت محمد زبیرؒ نبیرہ و خلیفۂ حضرت حجۃ اللہ نقشبندی بہت عبادت گذار تھے، دولت دنیا و دین دونوں سے سرفراز تھے، عصر کی نماز کے بعد مشکوٰۃ اور مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی کا درس بھی دیا کرتے تھے، بادشاہ وقت اور امرای عصر ان کے مرید و معتقد تھے، ۱۱۵۲ھ میں وفات پائی، پہلے دہلی میں مدفون ہوئے، پھر تابوت مبارک سرہند لے گئے، اس طرح مزار مبارک سرہند میں ہے، (غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول ص ۶۶۹) [4] حضرت حافظ سعد اللہ، حضرت محمد صدیق فرزند و خلیفۂ حضرت محمد معصوم کے خلیفہ ہیں، تیس سال تک اپنے مرشد کی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کئے، چنانچہ

ان سے استفادہ کیا[۱]، شاہ غلام علی کا بیان ہے، کہ میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان کی خدمت کی برکت سے مجھے بہت فائدہ پہنچا اور ہر روز انوار باطن میں ترقی ہوتی گئی اور وسعت نسبت بڑھتی گئی،[۲]

حضرت حافظ سعد اللہ کی وفات ۱۱۵۲ھ کے بعد جب حضرت شیخ محمد عابد[۳] سنامی[۴] سرہند سے شاہ جہاں آباد آئے، تو میرزا صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید کی تمام بشارات کو مسلم رکھتے ہوئے نقطۂ آخر ولایت و آغاز کمالات نبوت

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳) وہ خود فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ میں نے تیس سال اپنے مرشد کی خدمت کی ہے، ایک بار ان کے مرشد نے انھیں احمد آباد بھیجا، تمازت آفتاب کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی مگر دیدۂ دل نور معرفت سے روشن ہوگیا، خانقاہ میں ان کا لقب سید الصوفیہ تھا، مزاج میں خاکساری و فروتنی بہت تھی، علوم ظاہر میں کوئی خاص مرتبہ نہیں تھا، لیکن نسبت باطنی بہت قوی تھی، صاحب مقامات مظہری نے ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے، کہ ان کی خانقاہ میں ایک بلی تھی، وہ ان کے تصرف سے گوریوں پر بڑی مہربان تھی، وہ اپنا منہ کھولتی اور اس میں گیہوں کے چند دانے ڈال دیئے جاتے، گوریاں آتیں اور اس کے منہ میں سے دانے چنتیں اور اس کے ساتھ کھیلتیں، حضرت حافظ سعد اللہ نے ۱۲ شوال ۱۱۵۲ھ کو انتقال فرمایا، شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۱۰، ۱۱)

(حاشیہ ص ہذا) [۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۱۶ [۲] شاہ غلام علی مقامات مظہری ص ۲۷ [۳] حضرت شیخ عبدالاحد کے اعاظم خلفا میں سے تھے، ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے بہت کثیر الاتباع ذکیر اللہ کرتے تھے، حدیث و فقہ کا درس بھی دیتے تھے، مختصر یہ کہ علم و عمل اور زہد و تقویٰ میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے، ان کی خانقاہ اہل اللہ کا ملجا و ماویٰ تھی، تقریباً دو سو علما و صلحا ان کے حلقہ میں موجود ہوتے تھے، جو لوگ ان کے فیض توجہ سے استغراق و بیخودی، ولایت وغیرہ کے درجہ پر پہنچے وہ شمار سے باہر ہیں جمعہ کے

سے کسبِ مقامات کرایا اور سات سال کے عرصہ میں انھیں حقیقت صلوٰۃ تک پہنچایا[۱]،

اس کے بعد بطور "سیر مرادی" ایک بار پھر ابتدا سے انتہا تک ایک سال کے اندر ان تمام مقامات کو طے کرایا اور خصوصیاتِ مجددیہ میں محبت و محبوبیت، ولایت کبریٰ وغیرہ کی بشارت دی، اس کے علاوہ طریقۂ قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ کی بھی اجازت دی، اس دوران میں اکثر مبتدیان خانقاہ نے میرزا صاحب سے کسب فیض کیا[۲]، وہ حضرت شیخ عابد کی خدمت میں ان کی وفات (۱۱۶۰ھ) تک کسب فیض کرتے رہے[۳]، صاحب مقامات مظہری لکھتے ہیں کہ میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ولایات ثلثہ[۴] و کیفیات و علوم و واردات آں "حضرت شیخ عابد کے فیض تربیت سے مجھے حاصل ہوا اسی طرح" کمالات ثلثہ[۵] و حقائق سبعہ وغیرہ" بھی میں نے انھیں کے فیض توجہ سے کسب کیا[۶]،

میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں نے نسبت طریقۂ قادریہ و طریقۂ چشتیہ علی الترتیب حضرت قطب ربانی شیخ گیلانی اور خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہما سے بطور اویسیت حاصل کی ہے[۷]،

ارشاد و ہدایت :

تقریباً تیس سال تک مشائخ نقشبندیہ و مجددیہ سے کسب فیض کرنے کے بعد جب

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) روز خصوصاً حلقہ میں اجتماع بہت ہوتا تھا، حرمین شریفین کو پیادہ پا تشریف لے گئے تھے، ۸ / رمضان المبارک ۱۱۲۶ھ کو مرض اسہال میں انتقال فرمایا، (شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۱۱ تا ۱۳، غلام سرور، خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۳، ۶) [۱] سنام سرہند کے پاس ایک جگہ ہے۔ [۲] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۷، [۳] ایضاً ص ۷، [۴] ولایات ثلثہ (۱) ولایت صغریٰ (۲) ولایت علیا (۳) ولایت کبریٰ [۵] کمالات ثلثہ (۱) عرفان (۲) بقا (۳) فنا [۶] حقائق سبعہ (۱) حقیقت نفس (۲) حقیقت قلب (۳) حقیقت سر (۴) حقیقت روح (۵) حقیقت خفی (۶) حقیقت اخفا (۷) حقیقت تکوین، [۷] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۱۲، [۸] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص

مرزا صاحب خود صاحبِ کمال ہو گئے تو مسندِ ارشاد و ہدایت پر بیٹھے اور اپنا سارا وقت طالبانِ حق کی رہ نمائی کے لئے وقف کر دیا، ان کے طریقے کو ان کے نام کی رعایت سے طریقۂ شمسیہ مظہریہ کہتے ہیں،[1]

مرزا صاحب کے پاس جب کوئی مرید ہونے کے لئے آتا تو کچھ تو اس کے صدقِ طلب اور صحتِ اعتقاد کی آزمائش کی خاطر اور کچھ انکسار سے اس سے فرماتے کہ دہلی میں نامور شائخ کی کمی نہیں اُن سے رجوع کرو اور جس کی طرف دل مائل ہو اس سے بیعت کر لو، یہ خانقاہ تو بے آب و دانہ اور متصوفین کے رسوم و عادات سے بیگانہ ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اتباعِ سنت و اجتنابِ بدعت پر ہے، لیکن اس عذر و نصیحت کے باوجود اگر اس میں صدقِ طلب و صحتِ اعتقاد و راسخ و صادق پاتے تو اسے استخارہ کرنے کا حکم دیتے اور اس کے بعد اسے ایک ہفتے کے بعد بلاتے، اگر اس کا ارادہ پختہ ہو جاتا تو اسے مرید کر لیتے،[2]

پیری و مریدی کے سلسلے میں مرزا صاحب کا ایک واضح بیان ملفوظات میں بھی ملتا ہے، وہ فرماتے ہیں "پیری و مریدی دریں طریقہ محض بہ بیعت و شجرہ و کلاہ نیست، تعلیم ذکرِ قلبی و حصولِ جمعیت و توجہ الی اللہ در صحبتِ مرشد ضرور است، اختیار اشتغالِ طریقہ بجہت حصولِ غلبۂ محبتِ الٰہی ست، نگاہی فرط محبت محض لوہیت بود و الا دوام ذکر بشرائط آں فرضِ طریقۂ دوستانِ خدا ست،[3]

تصوف محض ایک رسم نہیں بلکہ تصفیۂ باطن یا تکمیلِ اخلاق کا ایک ذریعہ ہے، اگر تقدس و پاکیزگی کا اثر اخلاق پر نہ پڑا تو وہ ایک بے سود چیز ہے، چونکہ عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت خرابیاں اور کمزوریاں زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے انھیں مرید کرتے وقت

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۴۳-۴۴ [3] کلماتِ طیبات، ملفوظاتِ مرزا صاحب ص ۷۷،

میرزا صاحب ان سے چھ مزید وعدے لیتے تھے اور وہ وعدے یہ تھے،

(۱) کسی چیز کو خدائے تعالیٰ کا شریک نہیں بنائیں گی، اگر کسی کے اعمال میں ریا اور سمعہ ہے اور وہ خدائے تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے کچھ مانگتا ہے تو وہ شرک کے دائرے سے باہر نہیں اور اسے موحد اور مخلص نہیں کہا جاسکتا،

(۲) چوری نہیں کریں گی، کم عورتیں ایسی ملیں گی جن میں یہ عیب نہ پایا جاتا ہو، شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا بھی سرقے میں داخل ہے اور ایسا سرقہ سرقۂ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے،

(۳) زنا سے بچیں گی، اس شرط کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ زنا میں اکثر و بیشتر عورت کی رضامندی کو دخل ہوتا ہے، یعنی اس فعل شنیع میں عورت اولیت کرتی ہے اس لئے اس کی نہی کی شرط لینا ضروری ہے،

(۴) اولاد کو قتل نہیں کریں گی،

(۵) کسی پر بہتان و افترا نہیں لگائیں گی، یہ عیب مردوں میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن عورتوں میں زیادہ پایا جاتا ہے اس لئے ان سے خصوصیت کے ساتھ اس کا وعدہ لیتے تھے[۱]

(۶) معصیت اور حضرت پیغمبر کی نافرمانی سے اجتناب کریں گی،

یہ شرائط حقیقۃً وہی ہیں جن کی ہدایت عورتوں کی بیعت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے رسول پاک کو فرمائی تھی[۲]

میرزا صاحب نے ۳۵ سال سلسلۂ مجددیہ کو رونق بخشی اور بے شمار سالکوں کو مقامات سافلہ سے مقامات عالیہ تک پہنچایا، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ تقریباً سو طالبانِ حق

---

[۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۴۵ - ۳۴ [۲] قرآن مجید، ص ۲۸ - ۶۰

کو توجہ نہ دیتے رہے ہوں[۱]؎ خود میرزا صاحب نے اپنے متعدد مکتوبات میں اس کا ذکر کیا ہے مثلاً ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں کہ "دریں بقعہ ہم قریب صد کس را صبح وشام بقعہ می شود[۲]؎"

میرزا صاحب کے آفتاب رشد و ہدایت کی روشنی صرف دہلی کے مطلع تک محدود نہ تھی، بلکہ اس کی شعاعیں دہلی سے باہر دوسرے علاقوں کو بھی منور کر رہی تھیں، وہ ضعف پیری کے باوجود دہلی سے باہر دوسرے علاقوں خصوصاً روہیل کھنڈ اکثر جایا کرتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "آمدن ما در آں حدود ...... برای ترویج طریقہ است[۳]؎" ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "انشاء اللہ تعالیٰ در ماہ صفر ارادہ سنبھل دارم کہ از چندیں سال ہر سال اتفاق می افتد می رسم[۴]؎" ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ "فقیر از سیر امروہہ و مراد آباد فارغ شدہ است و قصد تماشائے شاہ جہاں پور دارد، انشاء اللہ عنقریب می رسد، دو سہ مقام در بریلی کردہ روانہ پیشتر می شود و پنج وشش مقام در شاہ جہاں پور نمودہ مراجعت بہ سنبھل می نماید بعد ازاں بہ دہلی می رود[۵]؎"

میر حسن نے اپنے تذکرے میں میرزا صاحب کے حالات جس وقت لکھے ہیں وہ سنبھل و مراد آباد میں ترویج طریقہ میں مشغول تھے،[۶]؎

میرزا صاحب کے مریدوں میں روہیلوں کی تعداد زیادہ تھی چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ "ہجوم روہیلہ ہا برای اخذ طریقہ بحدیست کہ تمام روز از توجہ فرصت نیست[۷]؎"

اسی مکتوب میں آگے چل کر وہ پھر اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

۱؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۷، ۲؎ کلمات طیبات، مکتوبات مرزا صاحب، مکتوب چہل ونہم ص ...، ۳؎ ایضاً مکتوب پنجاہ و پنجم ص ۵۳ ۴؎ ایضاً مکتوب بست و ہفتم، ص ۴۱ ۵؎ ایضاً مکتوب پنجاہ و دوم ص ۵۲ ۶؎ تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۰ ۷؎ کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ہفتاد و چہارم ص ۶۲،

"مردم از قوم روہیلہ اکثر و از مردم ہندی کمتر اخذ طریقۂ علیا نمودند و منور و متاثر گردیدند[1]"

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب دہلی کی حالت روز بروز بد سے بد تر ہوتی جا رہی تھی اور میرزا صاحب کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ دہلی چھوڑ کر اور کہیں اپنا مسکن بنائیں تو نگاہ انتخاب روہیل کھنڈ ہی کے علاقہ پر پڑی تھی، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"بجذب قسمت و جاذبۂ احباب فقیر از دہلی بہ سنبھل رسید و امروہہ و مراد آباد را ہم دید تا بانتخاب پردازد کہ رخت اقامت در کجا اندازد و متعلقان را طلبیدہ نگاہ دارد کہ از تشویشات ہر روزۂ دہلی تنگ آمدہ است ...... مردم سنبھل و مراد آباد و امروہہ کہ سہ بلاد است سماجت نمودند کہ ایں جا باید بود، جاذبہ و حقوق نواب ارشاد خاں[2] بہادر سلمہ ربہ نگذاشت کہ قصد جای دیگر کنم و طالبان طریقہ نیز دریں شہر بسیار اند عزم اقامت نمودہ آدم برای طلب متعلقاں فرستادم، آنہا عذرہای مسموع نوشتند، ناچار بمراجعت دہلی اتفاق افتاد[3]"

مکاتیب سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب کے معتقدین دکن میں بھی تھے، مثلاً ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ،

"فقیر از تحریر جواب خطوط صاحبان دکن خود را معذور داشتم کہ بعد ہزاراں سال خطوط ہم دیگر می رسد، توقع زندگی کجاست کہ رنج تحریر باید کشید و خود را

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ہفتاد و چہارم ص ۷۲ [2] میرزا صاحب کے مخصوص دوستوں میں تھے، انھوں نے میرزا صاحب سے کسب فیض بھی کیا تھا اور اجازت ارشاد طریقہ حاصل کی تھی، (شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۸۵)
[3] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہلم ص ۴۸،

بیاد دوستاں باید داد[1]"

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ میرزا صاحب ہر روز تقریباً سو آدمیوں کو توجہ دیتے تھے، لیکن ان سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی، اور اب وہ مجبور تھے کہ اس سلسلے میں کوئی نیا حل سوچیں، چنانچہ غور و فکر کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے،

"میر مبین[2] خاں را کہ از مقامات مصطلحہ گذشتہ و اجازت مطلقہ یافتہ و در توجہ گرمی بسیار دارند و اتفاقاً دریں ایام از شہر برای دیدن فقیر رسیدہ بودند بجای خود دریں بلاد گذاشتہ ام، مردم از صحبت ایں بزرگ زادہ بسیار فیض می گیرند و خیلی رجوع کردہ اند. اما کاریک کس نیست کہ از عہدۂ ایں قافلہ برآید و بخاطر دارم کہ شما را ہم طلبیدہ بعض شہر را بہ شما و بعض را بہ مبین خاں تفویض نمائیم[3]"

مولوی ثناء اللہ سنبھلی[4] کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ،

"شما در آنجا رفتہ جای فقیر گرم سازید کہ دراں ضلع عالمی فہمیدہ و درویشی صاحب نسبت نیست[5]"

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بست و پنجم ص ۴۰ [2] میر محمد مبین خاں میرزا صاحب کے عمدۂ اصحاب و زبدۂ احباب میں سے تھے، کمالات ظاہری و باطنی دونوں سے آراستہ تھے، انھیں میرزا صاحب سے محبت راسخ تھی اور ان کے اوضاع و اطوار کی پیروی میں جہد بلیغ کرتے تھے، میرزا صاحب ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "میر مبین انموذجی خدای کبیر و جان جاناں صغیر است،" (شاہ غلام علی مقامات مظہری ص ۱۰۱) [3] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب مکتوب ہفتاد و چہارم ص ۷۳ [4] میرزا صاحب کے اعاظم خلفاء میں شمار ہوتے ہیں، علم حدیث اور قرآن حضرت شاہ ولی اللہ محدث سے پڑھنے کے بعد خواجہ موسیٰ خاں سے طریقۂ ذکر و مراقبہ حاصل کیا، پھر انھیں کے ارشاد کے مطابق

آخر عمر میں میرزا صاحب کی صحت خراب اور قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اس کے اشارات بھی ان کے مکتوبات میں ملتے ہیں، ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں کہ،

"قویٰ آں قدر بہ تحلیل رفتہ کہ طاقت قیام در نماز فرض ماندہ است وبس[۱]"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ "ضعف پیریست مع امراض و عوارض[۲]" ایک دوسرے مکتوب میں ہے کہ،

"تحریر جواب خطوط از ضعف نمی توانم نمود، حالا بدوستاں نوشتہ ام کہ امید وارد منتظر جوابہا نہ باشند کہ معذورم و مردہ ام و مرا طاقت رفتن بہ مسجد جامع روز جمعہ نہ ماندہ است.... ضعف و ناتوانی از حد گذشتہ است و امراض متعددہ مستولی شدہ، نماز فرض ایستادہ خوانم وبس[۳]"

ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ "عمر آخر است و ضعف و پیری از حد زیادہ۔ خدا خاتمہ بخیر گرداند توقع ملاقاتہا ضعیف است، امااز قدرت الٰہی امید قوی است[۴]"

درازیٔ عمر کے باعث میرزا صاحب کی بصارت میں بھی کمی آگئی تھی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "از ضعف بصر رونق در تحریر نماندہ، طاقت تحریر ہم نہ۔ یاراں بعد ازیں از جواب خطوط معذور دارند[۵]"

(بقیہ حاشیہ ص ۵۰) استفادہ کمالات باطنی میرزا صاحب سے کیا، اور سلوک کے مقامات طے کرنے کے بعد اپنے وطن سنبھل میں بدرس علوم و ہدایت سلوکِ راہ خدا میں مشغول ہو گئے، علم و عمل اور صبر و استقامت سے موصوف اور اخلاق نیک و اوقات حسنہ کے لئے معروف تھے، (شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۷۳) کلمات

طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بست و ششم ص ۴۱ [۲] ایضاً مکتوب بست و ہفتم ص ۴۱ [۳] ایضاً مکتوب سی و یکم ص ۴۳ [۴] ایضاً مکتوب سی و نہم ص ۴۵ [۵] ایضاً مکتوب پنجاہ و ہفتم ص ۵۷ [۶] ایضاً مکتوب سی و دوم ص ۴۳،

لیکن اس ضعف و ناتوانی کے باوجود وہ اپنے کام میں برابر لگے رہے اور اپنے مریدوں کو فیوض باطنی پہنچاتے رہے، میر سلمان کو لکھتے ہیں کہ "چہ کنم از ضعف پیری و کثرت تعلیم طریقہ کہ روزی صد کس را بل زیادہ ازاں توجہ اتفاق می افتد"[1]۔ ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "در حلقہ ہر دو وقت قریب صد کس حاضر می شوند، حیرانم کہ قوت توجہ از کجا می آید"[2]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے باہر عارضی قیام ہونے کی وجہ سے حلقہ زیادہ ہوجاتا تھا، سید موسیٰ خاں کو انھوں نے پانی پت سے جو خط لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہر روز چہار وقت حلقہ می شود در صبح و نصف النہار و شام و (وقت) خفتن مرداں حاضر می شوند"[3]۔

صاحب مقامات مظہری لکھتے ہیں کہ خود میرزا صاحب کے بیان کے مطابق ہزاروں آدمیوں نے ان سے کسب فیض کیا اور اپنی زندگی دوام ذکر خدا میں گذاری، دو سو مریدوں نے تعلیم طریقے کی اجازت حاصل کی، اور دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ بنے[4]۔

ارشاد و ہدایت کا یہ سلسلہ مکاتیب کے ذریعے بھی جاری رہتا تھا، مثلاً ایک مرید کو مشورہ دیتے ہیں کہ "باید کہ آں برخوردار بظاہر مقید بہ شرع و در باطن مشغول بذکر طریقہ باشد کہ فلاح دوجہاں دریں کار منحصر است و ایشاں (زن مرید) را نیز باید کہ بذکر قلبی مقید باشند و التزام شریعت و محبت مشائخ و دوام شغل باطن واجب دانند"[5]۔ ایک مرید کو تنبیہ کرتے ہیں کہ، "فقیر در معاملہ معلوم کردم کہ والدۂ شما در باطن ناخوش اند ر ناخوشیٔ والدہ موجب خسارت دنیا و آخرت است، خصوصاً والدۂ مشفقہ، ایں معنی را استفسار نمودہ اگر اصلی داشتہ باشد

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بست و ہفتم ص ۴۰۔ [2] ایضاً مکتوب سی ویکم، ص ۴۰۔ [3] عبدالرزاق قریشی مرتبہ مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۲۴، ص ۱۲۰۔ [4] شاہ غلام علی مقامات مظہری ص ۳۳۔ [5] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب سی و ہفتم ص ۴۲۔

کفارت و مکافات بہ عمل آرند، اللہ تعالیٰ عواقب امور شان مقرون بخیر گرداند[1]" ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ "تا رسیدن فقیر یاران طریقہ کہ دہلی بھیت اند بہ مولوی عبدالرزاق[2] کہ بظاہر و باطن لیاقت ارشاد و تعلیم طریقہ دارند رجوع نمایند و صحبت ایشاں را غنیمت دانند[3]" ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ "شما بالتزام شریعت و شغل طریقت مقید باشید بہ مردم بہ خاکساری و بے نفسی معاملہ نمائید کہ کمال نفس نیستی است و ہستی حق تعالیٰ را مسلم است و صحبت علما و فقرا لازم گیرید و بر مکروہات زمانہ صبر گزینید...... ہر جا باشید باخدا باشید و بر محبت پیران طریقت باشید[4]"

ایک مریدہ کو لکھتے ہیں کہ "اگر با بزرگاں باادب و با خورداں بہ مہر و شفقت زندگی نمایند ہیچ کسی بدی باشمائی تواند کرد و در اطاعت و خدمت شوہر کہ فلاح دین و دنیا و رضای او تعالیٰ موقوف بر آنست باید کوشید..... و تقید در نماز ہم باید کرد...... اگر مستورات توفیق یابند و از شما توجہ خواہند البتہ توجہ بدہید، اجازت است تاثیر خواہد شد[5]"

اپنے ارشد مریدین قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ "برادر من عجب کاریست کہ ہر واحد از مردم پانی پت لبریز شکایت شما می آید معلوم نیست چہ عمل از شما واقع می شود، اگر راستی و دیانت شما باعث آزار مردم است از آں راستی بگذرید برای حفظ حرمت بتاویل ہم خاطر مردم را مرعی دارید کہ طریقہ پیران طریقہ بدنام می شود، برای خاطر

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب سی و ہشتم ص ۴۰، [2] علم فقہ و اصول میں مہارت رکھتے تھے، میرزا صاحب کے فیض صحبت سے حالات نیک پیدا کئے اور مدارج قرب الٰہی طے کرکے سلوک کے بلند مرتبہ پر پہونچے اور تعلیم طریقہ کی اجازت حاصل کی (شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۸۶ [3] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہل و نہم ص ۵۱ [4] ایضاً مکتوب سی و دوم، ص ۳۴ [5] ایضاً مکتوب ہشتادودوم ص ۷۰،

لئیمان دیگراں را آزردہ کردن و خود را بدنام ساختن با ایں کمالات ظاہری و باطنی دور از عقل است، انکار مردم باعث خرابی کارخانۂ ارشاد است[1]۔"

بعض اوقات میرزا صاحب کو اپنے مریدوں کے مریدوں کی تربیت کی بھی ذمہ داری لینا پڑتی تھی، مثلاً وہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "میاں محمد میر صاحب کہ باکثر وجوہ از اکثر یاران طریقہ ممتاز بودند نوزدہم ایں ماہ بہ مرض ذات الصدر رحلت نمودند.... ایشاں نہ فرزندی گذاشتند و نہ خلیفہ، تربیت یاراں ایشاں و تدبیر علائق ایشاں بگردن فقیر افتاد[2]۔"

اسی طرح مکاتیب سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب بعض اوقات غائبانہ طور پر بھی اپنے مریدوں کو توجہ دیتے تھے، مثلاً ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ "ہر صبح بعد نماز متوجہ بہ فقیر بہ نشینید، بی ناغہ توجہ می دہم از کسی دیگر توجہ نگیرید[3]۔" ایک اور مرید کو لکھتے ہیں کہ "آں برخوردار را بگویند کہ ہر صباح متوجہ فقیر شدہ بہ نشینید او را خود توجہ نہ دہد[4]۔"

مریدوں کی تربیت باطنی کے علاوہ میرزا صاحب ان کے دنیاوی امور میں بھی کوشش و سفارش سے دریغ نہ کرتے لیکن یہ سفارشیں اپنے مریدوں، نیازمندوں اور دوستوں سے ہی کرتے، میر سلمان کو لکھتے ہیں کہ "چوں سلب امراض قلب و قالب معمول حضرات ماست رضی اللہ تعالیٰ عنہم و حق تعالیٰ آں جناب را قوت و قدرت آں عطا کردہ است چرا از راہ انکار خود را دریں امر معذور دارند، فیض اللہ خاں صاحب را پیش رو

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ہفتاد و ہفتم ص ۸۴ [2] ایضاً مکتوب سی ام ص ۴۰ [3] ایضاً مکتوب چہل و دوم ص ۴۹ [4] ایضاً مکتوب سی ام ص ۴۲

نشانیدہ بقدر بالنصد نفس سلب مرض ایشاں نمایند تاکید است[۱]"

ظفر علی خاں[۲] سے میرزا صاحب کو خاص طور پر محبت تھی، ان کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "بخدمت تصدیع می دہم کہ بحق دوستیہای قدیم والتفاقی کہ بر فقیر مبذول است شفقتی کہ لائق بزرگیہای آں مہربان باشد در حق این جگر گوشہ کہ مرا عزیز تر از جان است بذل فرمایند[۳]"

ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "میر بہجو صاحب... از گردش روزگار قصد پور ب کردہ اند بہ خدمت خواہند رسید... بقدر مقدور در تلاش روزگار و معاش ایشاں توجہ خواہند نمود[۴]"

ایک دوسرے مرید محمد شاہ کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں: "محمد شاہ از یاران حلقہ است وکسب کمال کردہ... باوجود عیالمندی وجہ معیشتی ندارد... اگر وجہ معاش قلیل... از سرکار دنیاداران این مملکت بہ سعی شما میسر آید موجب اجر عظیم وہم سبب رضامندی درویشان است[۵]"

سکھوں نے سرہند کو لوٹ لیا اور بزرگان دین کے مزارات کو شہید کر دیا ہے، یہ افسوسناک اطلاع دینے کے بعد مکتوب الیہ کو لکھتے ہیں کہ "جماعتی قصد آں طرفہا

---

[۱] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بست و چہارم ص ۲۹ [۲] نواب ارشاد خاں رئیس سنبھل کے بیٹے اور نواب امین الدولہ کے پوتے تھے، شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری کی اولاد میں تھے، باپ کی طرح یہ بھی میرزا صاحب کے مرید تھے، چنانچہ میرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ "تربیت ظاہری و باطنی از فقیر یافتہ" (مکتوب چہل و چہارم ص ۴۹) میرزا صاحب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے اور خطوط میں ان کی بہت تعریف کرتے تھے، [۳] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہل و چہارم ص ۴۹ [۴] ایضاً مکتوب چہل و ہشتم ص ۵۵ [۵] ایضاً، مکتوب چہل و نہم ص ۵۵،

گردہ اند خصوصاً میر اسد اللہ صاحب کہ بافقیر خصوصیت دارند، تشریف می آرند اگرچہ احوال آں ملک مردم آنجا مخفی نیست لیکن بہ ضرورت مرقوم می گردد کہ اہل طریقہ را بقدر مقدور بدست وزباں درخواست ایشاں مقصر نمی باید بود[1]"

اسی طرح ایک مکتوب میں لالہ برج لال کی سفارش کی ہے، لالہ صاحب تلاش معاش میں اپنے وطن آگرے سے دہلی گئے ہیں،

"لالہ برج لال نام جوانی از دوستان مقرری کہ در حسن سلوک سلیقہ منصد بگری وصحبت داری بزعم فقیر نظیر ندارد وعمدہ زادہ وعمدۂ روزگار بودہ است۔۔۔ منتظر بودیم کہ زود بیائید وایں نسخۂ صحیحۂ آدمیت را با آقای خود برخورانیدہ احسان دست بستہ در حق فقیر۔۔ کردہ باشد وباید کہ پیش از رسیدن بہ تقریبات مستحسن خداوند نعمت خود را مشتاق او سازید وازیں معنی مارا اطلاع دہید تا مسرور باشم[2]"

غرض اسی طرح مختلف مریدوں اور دوستوں کی سفارش اپنے ذی استطاعت، مریدوں اور دوستوں سے کرتے رہتے، وقت کے بعض ارباب اقتدار واختیار ان کے نیازمندوں میں داخل تھے، لیکن میرزا صاحب ان سے سفارش کرنے میں احتیاط برتتے تھے، ایک خط میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھتے ہیں کہ "بجانب مجد الدولہ کہ۔۔۔ تغیر مزاج ایشاں در عروج مراتب دولت مشہور است، نوشتن مناسب وضع فقیر نیست۔۔۔۔ اگر مجد الدولہ اخلاصی دارد وحرکتے از طرف او واقع شود البتہ مرقوم خواہد شد[3]" اسی طرح اپنی بیوی کے متبنی پیر علی کو جسے وہ خود بھی عزیز رکھتے تھے، یوں سمجھاتے ہیں کہ "روز ملاقات

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب، پنجاہم، ص ۵۱ [2] ایضاً، مکتوب سی وششم، ص ۴۴،
[3] مکاتیب میرزا مظہرؒ، مکتوب ۵۶، ص ۷۷،

ایں قصہ را باشما مفصل گفتہ ام کہ خان ساماں و بخشی یعنی فتح خاں و سردار خاں را تمام عمر خود گاہی نہ دیدہ ام و دوندے خاں را کہ ارادۂ ملاقاتِ فقیر داشت، منع کردم کہ نیاید و حافظ رحمت خاں کہ پیش فقیر حاضر شدہ بود، محبت او با فقیر نادرست افتاد و پسران علی محمد خاں را ہرگز نمی شناسم، ربط کجا؟ سفارش معلوم[1]"

شعر و شاعری

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ میرزا مظہرؒ عین شباب کے زمانے میں دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور حضرت سید نور محمد بدایونیؒ کے رشد و ہدایت کی روشنی میں سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے، لیکن ذوق عرفان کے ساتھ ساتھ قدرت نے انھیں مذاق سخن بھی عطا فرمایا تھا، خود ان کے قول کے مطابق شاعری و پریشان نظری ان کے خمیر[2] میں تھی، اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں بھی انھوں نے لکھا ہے کہ "فقیر در ہنگام جوانی تحریک شور عشقی کہ نمک خمیرش بود، نالہ ہای موزوں می کرد" لیکن جب ہنگام جوانی ختم ہو گیا، تحریک شور عشقی سرد پڑ گئی، سلوک کی منزلیں طے ہونے لگیں اور حجابات اٹھنے لگے تو شعر گوئی سے دلچسپی اگر جاتی نہیں رہی تو کم ضرور ہو گئی، خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ جب میں حضرات نقشبندیہ کے سلسلے سے منسلک ہو گیا تو اس قدر مغلوب حال ہو گیا کہ وہ تمام کیفیتیں دل سے چھن گئیں اور مجھ میں اتباع سنت کے خلاف قدم اٹھانے کی طاقت نہ رہی اور شعر گوئی سے دلچسپی جاتی رہی اور اب حضرات مشائخ کے حکم سے تیس سال سے طالبان خدا کی ہدایت اور دوستوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہوں[3]،

میر تقی میرؔ نہ صرف یہ کہ میرزا صاحب کے ہم عصر تھے بلکہ ان کی خدمت میں انھیں

---

[1] کلمات طیبات، المکتوبات میرزا صاحب، مکتوب پنجاہ و چہارم ص ۵۲-۵۳ [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، [3] ایضاً ۱۱-۱۲

نیاز بھی حاصل تھا، ان کے بیان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ نکات الشعرا کی تحریر کے وقت (۱۱۶۵ھ) میرزا صاحب کو شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی، لیکن انھوں نے اسے ترک بھی نہیں کیا تھا، میر صاحب لکھتے ہیں کہ ان کا (میرزا مظہر کا) اکثر وقت یادِ الٰہی میں صرف ہوتا ہے، اگرچہ شعر کہنا ان کے مرتبے سے گری ہوئی بات ہے پھر بھی وہ کبھی کبھی اس بے حاصل فن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں[1]۔ فتح علی گردیزی بھی میرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کے ہم مشرب و مداح تھے، اور دہلی میں رہتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ (میرزا صاحب) اس مشغلے (شعر و شاعری) کو مایۂ افتخار نہیں سمجھتے لیکن چونکہ عشقِ سخن ان کے آب و گل میں داخل ہے، اس لئے جب کبھی انھیں صوفیانِ خانقاہ و مستفیدانِ خدا کی صحبت سے فرصت ملتی ہے وہ اس شغلِ بے حاصل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں[2]۔

ایک تیسرے معاصر قائم چاند پوری کا بیان ہے کہ میرزا صاحب اوائلِ جوانی میں شعر و شاعری کرتے تھے لیکن آگے چل کر ترک کر دیا[3]۔ ایک اور معاصر قدرت اللہ شوق نے تقریباً یہی بات کہی ہے، یعنی میرزا صاحب عالمِ شباب میں شعر و سخن کی طرف توجہ فرماتے تھے، مگر اب ایک مدت سے سخن گوئی ترک کر کے شغلِ تقرد و فنا اور ارشادِ طالبان کے علاوہ اور کسی شغل سے دلچسپی نہیں رکھتے[4]۔ خود میرزا صاحب نے بھی اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "ہرچہ خارج ازیں جمع است طرح داند مگر از واردات تازہ کہ بسیار کم اتفاق می افتد"۔ اسی طرح ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "ذوقِ سخن از یاد رفتہ، بعد عمری غزل تازہ بر زبان رفتہ[5]"، اور یہ غزل صرف تین اشعار پر

---

[1] ص ۵ [2] تذکرۂ ریختہ گویان، ص ۱۰۱، [3] مخزن نکات، ص ۴۴ [4] تکملۃ الشعرا قلمی، [5] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب پنجاہ و ہشتم ص ۵۵،

مشتمل ہے،

ان بیانوں اور تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عمر کا آفتاب ڈھل جانے کے بعد میرزا صاحب کی شعر و شاعری سے دلچسپی بہت کم ہو گئی تھی،

تلمذ

آزاد بلگرامی سرو آزاد میں میر غلام نبی کے سلسلۂ حالات میں لکھتے ہیں کہ میرزا جان جاناں مظہر نے فن شعر ہندی غلام نبی بلگرامی سے اخذ کیا تھا[1] تذکرہ حسینی کے مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے میرزا بیدل سے استفادہ کیا تھا[2]، صاحب تذکرہ الشعرار نے بھی تذکرہ حسینی کے بیان کی تکرار کی ہے[3]، صاحب تذکرۃ الشعرار کا ماخذ تذکرہ حسینی ہے، کیونکہ یہ تذکرہ اُن کے ماخذ میں گنایا گیا ہے، اس لئے ان دونوں بیانات کو ایک ہی بیان سمجھنا چاہیئے، اس بیان کی تائید کسی معاصر یا بعد کے تذکرے سے نہیں ہوتی،

آزاد بلگرامی اگرچہ میرزا صاحب کے معاصر ہیں اور معتقد بھی لیکن ان کا بیان بھی مشتبہ ہے کیونکہ اس کی تائید کسی دوسرے معاصر تذکرے سے نہیں ہوتی، میرزا صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے نہایت مختصر حالات لکھے ہیں، اس میں اپنے اساتذہ کے نام صراحتہً لئے ہیں مگر اپنے کسی شاعر استاد کا نام نہیں لیا، خود آزاد بلگرامی کی درخواست پر اپنے مختصر حالات لکھ کر انھیں بھیجے تھے جسے آزاد نے سرو آزاد میں بعینہ نقل کیا ہے، اس میں بھی انھوں نے کسی استاد کا نام نہیں لیا، بلکہ اس سلسلے میں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ،

بجز کس نماند حرف من مظہر جو جز علم — خدا بے واسطہ تعلیم و اصلاح سخن کرد

---

[1] ص ۲ [2] حسین دوست سنبھلی، ص ۲۷، [3] عبدالغنی ص ۱۲۵،

تخلص:

میرزا صاحب کے زمانے میں ایک صاحب غلام علی نام کے تھے اور مظہر تخلص کرتے تھے، ایک دن انھوں نے میرزا صاحب سے کہا کہ میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اور میں نے یہ تخلص پہلے اختیار کیا ہے، پھر تم نے یہ تخلص کیوں رکھا؟ میرزا صاحب نے جواب دیا کہ مجھے یہ تخلص مولوی معنوی نے عنایت کیا ہے، چنانچہ یہ طے پایا کہ مثنوی معنوی سے فال لی جائے، شاہ غلام علی نے فال نکالی تو یہ شعر نکلا۔

جانِ اول مظہر درگاہ شد   جانِ جاں خود مظہر اللہ شد

آخر دونوں صاحبوں نے مظہر تخلص برقرار رکھا۔[1]

انداز شعر خوانی:

میرزا صاحب کے شعر پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا، صاحب سفینۂ ہندی کا بیان ہے کہ وہ اشعار کچھ اس طرح سے پڑھتے تھے کہ بہت سے لوگ سننے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔[2]

سیاسی حالات سے متاثر ہونا:

حضرت میرزا مظہرؒ اگرچہ تارک الدنیا تھے لیکن دنیا سے باہر نہ تھے، زاہد خلوت نشیں تھے مگر جلوت کی ہنگامہ آرائیوں سے بے خبر نہ رہتے، ایک ذہین و حساس آدمی اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے خبر رہ بھی نہیں سکتا، چنانچہ خود میرزا صاحب اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "احوال شہر تا اخبار محل از فقیر پنہاں نمی ماند، ما نچہ واقعیست بہ فقیر می رسد"[3] سیاسی مسائل کو سمجھنے اور گتھیوں کے سلجھانے کی جو صلاحیت اللہ نے

---

[1] بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی، ص ۲۰۸، [2] ایضاً [3] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ہفتادم ص ۶۰

انھیں عطا فرمائی تھی اس کا اظہار وہ خود کرتے تھے، شاہ غلام علیؒ کا بیان ہے کہ میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ مارا عقل کامل و اصابت رائے بلیغ عطا فرمودہ است از تدبیر امور سلطنت و انتظام مملکت..... لہذا امرای وقت مشورہ و صلاح مہمات خود از ما پرسیدہ بر آں عمل می نمودند"۔[1]

میرزا صاحب کی سیاسی یا ملکی معاملات سے دلچسپی سیاسی یا دنیوی منفعت کی خاطر نہ تھی بلکہ خلق خدا سے محبت اور ہمدردی کی بنا پر تھی، صاحبزادہ غلام عسکری خاں کو ملکی معاملات سے متعلق بہت کچھ لکھنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات خود غرضی کی بنا پر نہیں بلکہ محض خدا واسطے لکھی ہے، پھر آگے وہ لکھتے ہیں کہ نواب (عماد الملک) کی کامیابی ہی ہمارا مقصود ہے، بشرطیکہ ان کا وجود خلائق کے لئے فائدہ مند ہو[2]،

ان کے مکاتیب میں ایسے اشارے کافی تعداد میں ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی حالات سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور ان کا اثر بھی قبول کرتے تھے، مثلاً ایک مکتوب میں مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو یہ المناک اطلاع دیتے ہیں کہ "دریں روزگار الٰہی وقتی بدل راہ یافتہ، در ماہ گذشتہ قلعۂ تھانیسر را کفار سکھ متصرف شدند وقتل وغارت واسر درمیاں آمد"۔ اسی خط میں خاتمے پر لکھتے ہیں کہ "در امور سلطنت نسقی نماندہ خدا خیر کند"[3]۔

مرہٹوں کی شورش وہنگامہ خیزی سے متعلق ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ "از آشوب

---

[1] مقامات مظہری، ص ۳۳ [2] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب شصت وہفتم ص ۹۵ [3] ایضاً، مکتوب سی ویکم، ص ۴۳،

وہنگامہ کہ دریں حدود بسبب غلبۂ افواج جنوبی و فرار قوم روہیلہ واقع شدہ وقصبات ودیہات بتاراج رسیدہ، چہ نویسد، مفصل از خطوط عزیزاں معلوم خواہد شد۔[1]

شاہ عالم ثانی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سفارش پر نجف خاں کو اپنی ملازمت میں لیا تو اس نے رعایا کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، میرزا صاحب کے ایک خط میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "حال مردم ایں شہر از روزیکہ نجف خاں آمدہ است، از شاہ تا گدا تباہ است و ذکر خلاص مجد الدولہ بر زبان خاص وعام است، خدای تعالیٰ زود بہ ظہور آرد۔"[2]

ایک خط میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "پادشاہ تا نار نول رسید وقصد اجمیر دارد و نجف خاں ہم ارادۂ لشکر پادشاہ کردہ وکیول رام را نواب برای سوال جواب سکھاں بہ سرہند رخصت می کنند۔"[3]

ایک دوسرے خط میں قاضی صاحب کو مطلع کرتے ہیں کہ "شجاع الدولہ شورہ خود را در آشتی دیدہ بے توسط احدی بہ ملازمت عالی گہر رفت وملہار کہ شکست خوردہ بکالپی رفتہ بود، برنگشت وعماد الملک زندہ بہ فرخ آباد آمد وسرداران روہیلہ بر فاقت تن نداند وشاہ بہ اٹک رسید۔"[4]

اوپر کے اقتباسات بڑے بڑے اور اہم تاریخی واقعات کی طرف محض اشارے ہیں، لیکن ان سے یہ بات نمایاں ہے کہ میرزا صاحب حالات کی جزئیات تک سے واقفیت رکھتے تھے۔

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہل وششم، ص ۵۰ [2] ایضاً مکتوب سی وچہارم، ص ۴۵ [3] عبدالرزاق قریشی (مرتبہ)، مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۱۲۵، ص ۱۰۳ [4] ایضاً مکتوب ۲۲، ص ۲۹۔

شاہ ابدالی کے حملے ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، خصوصاً آخری حملے نے تو اس کی تاریخ کا رخ موڑ دیا، مرہٹوں نے پورے ہندوستان پر حکمرانی کا جو خواب دیکھا تھا اور جو بڑی حد تک صحیح ہوتا نظر آرہا تھا، اس حملے کی وجہ سے پریشان ہوگیا، میرزا صاحب کے ایک مکتوب میں ابدالی کے ایک حملے کا ذکر بھی پایا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"شاہ ابدالی در پشاور رخت اقامت انداختہ و تیمور میرزا پسر کلاں خود را با فواج بیکراں برای بندوبست ممالک خراسان رخصت کردہ اندیشۂ ممالک پنجاب و ملتان کہ ہر دو دریں ایام از نسق افتادہ، در سر دارد و غالب آنست کہ ایں کار از افواج خود بگیرد و اگر حاجت بحرکت خود داد خواہد افتاد تا لاہور و ملتان خواہد رسید، آخر ملک اوست، سرہندوستان ندارد و الوسات فراہم نیاوردہ فوج قدیم ہمراہ دارد و بس، و مردم دہلی کہ عادت بہ فرار دارند بے اختیار دستپا می شوند و ایں جا مراحمت بسیار است، و ہمیں مناسب است کہ فتنۂ از لاہور قصد دہلی نہ کند، آبروی بادشاہ بکیست، پای گریز نہ داریم عمل بر ایں آیت کردہ ایم عفض والی اللہ[1]"

نجیب الدولہ کی وفات (اکتوبر ۱۷۷۰ء) کے بعد شاہ عالم ثانی اور مرہٹوں میں یہ معاہدہ ہوا کہ اگر مرہٹے قلعہ دہلی اور مضافات کے پرگنوں کو ضابطہ خاں کے قبضے سے نکال کر ان پر شاہی قبضہ کرادیں تو اس کے عوض میں انھیں چالیس ہزار روپے دیے جائیں گے اور اس رقم میں سے دس لاکھ قبضہ ہونے کے بعد بیس دن کے اندر ادا کردیے

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب مکتوب ہفتاد و یکم، ص ٦١؛

جائیں گے، مرہٹوں کی طاقت اور مدد سے دہلی پر شاہ عالم کا قبضہ ہوگیا اور ۶، فروری ۱۷۷۱ء کو سیف الدین محمد خاں کشمیری[۶۲] کے ذریعے اس کی بادشاہت کا اعلان ہوا،[۶۳] قلعہ دار (قاسم علی خاں) نے جو ضابطہ خاں کی نیابت کر رہا تھا، مزاحمت کی اور قلعے کو مرہٹوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اس لئے انھوں نے گولہ اندازی شروع کی، مجبور ہو کر قلعہ دار نے ۱۰، فروری کو قلعہ مرہٹوں کے حوالے کر دیا،[۶۴] میرزا صاحب کے ایک مکتوب میں اس اہم تاریخی واقعے کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتا ہے:

"حقیقت ایں جا اینست کہ بیستم ماہ (شوال)، روز چہارشنبہ یک بار افواج مرہٹہ آں طرف آب جمنا وارد شد و صباح آں کہ پنجشنبہ بود سیف الدین خاں کشمیری نوشتۂ پادشاہ را نمودہ بے مزاحمت داخل شہر شد و منادی امان کردند و بہ ہیچ کس ضرری نرسید، الحمد للہ علیٰ ذالک۔ قلعہ دار و ناظر دو سہ روز قلعہ گیر شدہ بودند، از شدت گولہ اندازی برج قلعہ منہدم شد ناچار بعہد و پیمان قلعہ را دادند، اما سیف الدین خاں ہم بے دخل است قاصدان پیش پادشاہ رفتہ اند، انتظار جواب می کشند و ملیغیک بادشاہ برای استخلاص دلی از دست روہیلہ ہا با مرہٹہ ہا وعدہ کردہ می خواہند، باید دید چہ می شود۔"[۶۵]

---

۶۱ calendar of Persian correspondence جلد سوم، مکتوب ۷۰، ۶۲ شاہ عالم کا بڑا وفادار تھا، شاہ عالم کو اس کی تدبیر پر بھی اعتماد تھا، چنانچہ مذکورہ بالا معاہدہ بھی اسی کے توسط سے طے پایا تھا، calendar of Persian correspondence جلد ۳، مکتوب ۱۱۰، ۵۴۰، ۱۴، ۱۴، ۳۰، ۴۳، ۶۹۵، ۱۱۰۱، ۶۳ ایضاً مکتوب ۴۳۲، ۶۰۹، ۶۴ ایضاً مکتوب ۳۳۲، ۶۵ عبد الرزاق قریشی، مرتبہ مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۳۰، ص ۵۱۔

مذکورۂ بالا واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ مکتوب الیہ کو مندرجۂ ذیل اطلاع بہم پہنچاتے ہیں،

"مرہٹہ ہا برای تماشای شہر می آیند و می روند، تقید است، داخل نہ شوند غلہ گراں شدہ بود، فی الجملہ ارزاں شدہ، سرداران دیگر تکوجیہ را با ضابطہ خاں موافق بود، فریب دادہ بایلغار بہ دہلی آمدند آں بیچارہ برعایت عہد بعد مطلع شدن، ازیں امر ضابطہ را کہ فوج او بی دل بود، ہمراہ گرفتہ بسلامت بہ سکرتال رسانید و برگشت[1]"

نواب مجد الدولہ کو شاہ عالم ثانی کے عہد میں بڑا اقتدار حاصل تھا، لیکن وہ مخلص نہیں تھا، اس لئے اس کے اقتدار کو زوال آگیا، اس کے سب سے بڑے حریف نجف خاں نے بادشاہ کی اجازت سے اسے قید کر لیا، اور اس کا گھر اور مال و اسباب سب ضبط کر لیا گیا[2]، اس کی قید کا کسی قدر مفصل حال میرزا صاحب نے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے دریافت کرنے پر ان کو لکھ بھیجا تھا جو حسب ذیل ہے

"مجد الدولہ بعد مراجعت از پانی پت و ملازمت پادشاہ پنجم ایں ماہ (ذیقعدہ) باستقبال نجف خاں، بعد قسم قرآن در رکاب شاہزادۂ فرخندہ بخت رفتہ بودند و پادشاہ با نجف ساختہ بود تا نجف بہ ملازمت بیاید، افراسیاب خاں بیشتر از جہہ آمدہ در قلعہ بند و بست خود کردہ، مردم پادشاہی را بیروں آوردہ نجف خاں ملازمت کردہ بہ لشکر خود رفت افراسیاب خاں دہمدانی مجد الدولہ را در پیش خانۂ او نشاندند، روز دوم نجف خاں آمدہ بر مسجد طلائی پیش قلعہ نشست و تا آخر

---

[1] عبد الرزاق قریشی، مرتبہ مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۳، ص ۵۲ [2] کنور پریم کشور فراقی، وقائع عالم شاہی دفتر اول، ص ۱۱

روز سوال و جواب در گرفتن مجدالدولہ با پادشاہ کردہ و پادشاہ در ظاہر اصرار و انکار بسیار نمود، آخر مجدالدولہ را بر فیل نشانیدہ معہ قطب الدولہ بردند و بحرمت در خیمہ فرود آوردند، اما اسیر اند، امروز قطب الدولہ بخانہ خود آمدہ، باید دید کہ مجدالدولہ را چہ پیش آید۔ ۔ ۔ ۔ وخلعت مختاری و وزارت نجف خاں پوشید و بخشی گیری شاہزادہ جواں بخت را و توپ خانہ فرخندہ بخت را و غسل خانہ اکبر شاہ را مقرر شد، و بر خانۂ مجدالدولہ پادشاہ متصرف شد و اکثر متوسلان او پنہاں شدند۔[1]

اوپر جو بیانات نقل کئے گئے ہیں، ان کی تائید تاریخ سے ہوتی ہے، خصوصاً آخری اقتباس کے مندرجات کی تائید ایک انگریز مؤرخ فرینکلن کے بیان سے تقریباً حرف بحرف ہوتی ہے، فرینکلن ہندوستان میں کافی دنوں تک رہ چکا تھا۔[2]

شہادت:

جب میرزا صاحب کا سن اسّی سے تجاوز کر گیا تو وہ اکثر "ذکر رحلت و طلب دعای خیر خاتمہ و انتظار ملاء اعلیٰ و اظہار تمنای درجہ اعلای شہادت و کلمات متضمن وصایا و موعظت و وداع و رخصت" فرمایا کرتے،[3] وظائف و عبادات میں بھی اضافہ ہو گیا، اکثر مریدوں اور معتقدوں کو خطوط میں بھی اپنے وقت آخر سے متعلق اشارہ کرتے، مثلاً ملا عبدالرزاق کو لکھتے ہیں: "وقت رحلت نزدیک رسید و عمر از ہشتاد تجاوز نمودہ و توقع ملاقات نماندہ کہ مارا طاقت سیر و سفر نماندہ"۔[4]

۱؎ عبدالرزاق قریشی، مرتبہ، مکاتیب میرزا مظہر، ص ۱۲۰، ۲؎ History of the Reign of Shah Alam، ص ۸۵
Aalam Fran[illegible]lin ۳؎ غلام علی، معمولات مظہریہ، ص ۶۳، ۴؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، دیباچہ، ص ۱
مقامات مظہری ص ۶۰

ایک اور مکتوب میں یوں رقم طراز ہیں:

"والد بزرگوار شما کہ جامع ہزاراں مناقب بودند از انتقال خود ازیں عالم داغی بیادگار گذاشتند ... ما و ایشاں بہ علاقۂ ہم عمری در وقت قدوم بایں خاکدان بتقدیم و تاخیر چند قدم ہم سفر بودیم، حالانکہ وقت رجوع بوطن اصلی است نیز بہ فاصلہ چند نفس ہم قافلہ ایم ؎

امروز گر از رفتہ عزیزاں خبری نیست
فرداست دریں بزم ز ما ہم اثری نیست[1]

ایک دن ایک مرید اصلاح کلام کے ارادے سے خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ والد بزرگوار کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، میری آرزو ہے کہ یہ عزت مجھے بھی نصیب ہو، میرزا صاحب نے جواب دیا کہ اب ان باتوں کا دماغ کہاں اور اس کی فرصت کسے، جو چند لمحے یاد الٰہی میں گذر جائیں غنیمت ہیں، آج کل میں فقیر کے کوچ کرنے کی خبر سن لوگے، یہ کہہ کر مندرجۂ ذیل شعر یادگار کے طور پر انھیں لکھا دیا،

لوگ کہتے ہیں مرگیا مظہرؔ
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر[2]

صاحب معمولات مظہریہ کا بیان ہے کہ میرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں، حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روح جب تن سے جدا ہوتی ہے تو اسے خدا اور رسول کا شرف دیدار میسر ہوتا ہے[3]

میرزا صاحب کو ان ارواح طیبات سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا[4] جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندؒ اور

۱؎ کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب پنجاہ و ششم ص ۵۲ ۲؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۳۹ ۳؎ ایضاً ص ۳۸، ۴؎ ایضاً،

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم

صاحبِ معمولات لکھتے ہیں کہ میرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ زخمی ہوئے تو امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصیت کی کہ اگر میں سلامت رہا تو مجرم سے مواخذہ کرنا میرا کام ہے، ورنہ بصورتِ دیگر قاتل سے قصاص نہ لیا جائے...... اگر خدائے تعالیٰ نے مجھے شرفِ شہادت بخشا تو میں چاہتا ہوں کہ میرے خون کا بھی بدلہ نہ لیا جائے اور پھر بڑی حسرت سے فرماتے کہ ایامِ جوانی میں جب شہادت حاصل کرنے کا موقع تھا تو حاصل ہی نہ کر سکا اب بڑھاپے میں یہ سعادت کہاں نصیب ہو سکتی ہے مگر پھر خود ہی فرماتے کہ خدا سے مایوس نہ ہونا چاہیے[1]، چنانچہ زمانہ نے دیکھ لیا کہ خدا نے انھیں مایوس نہیں کیا۔

محرم کا مہینا تھا، میرزا صاحب اپنے مکان پر چند مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ اتفاق سے وہاں سے ایک تعزیہ نکلا، میرزا صاحب نے مریدوں کو مخاطب کر کے کہا کہ جس مقدمہ کو بارہ سو برس ہو چکے ہوں ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت نہیں ہے؟ لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا عقل کی خفت ہے، یہ بات ان لوگوں نے جو تعزیہ کے ساتھ تھے سنی اور امام باڑوں اور محفلوں میں دو تین شب اس کا چرچا ہوتا رہا[2]۔

۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ شب چہار شنبہ کا ذکر ہے کہ تھوڑی رات گذری تھی کہ چند آدمی مکان پر آئے اور دروازہ پر دستک دی، خادم نے جا کر عرض کیا کہ کچھ لوگ زیارت کے لئے آئے ہیں، میرزا صاحب یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ بلا لو، ان میں سے تین آدمی اندر آئے ان میں ایک ایرانی نژاد مغل تھا، میرزا صاحب اپنی خواب گاہ

۱؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۱۲۹، ۲؎ میرزا علی لطف: گلشن ہند ص ۲۱۷،

سے نکل کر آئے اور ان لوگوں کے پاس کھڑے ہو گئے، مغل نے پوچھا "آپ ہی میرزا جان جاناں ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "ہاں" اور اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی تائید کی، اس پر اس مغل نے میرزا صاحب پر طپنچہ کا وار کیا اور تینوں فرار ہو گئے، گولی بائیں جانب دل کے پاس لگی[۱] میرزا صاحب نے باوجودیکہ ایسا زخم کاری کھایا لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا[۲]

قدرت اللہ گوپاموی کا بیان ہے کہ میرزا صاحب تہجد کی نماز کے لئے اٹھے تھے کہ کسی ناہنجار نے انھیں گولی کا نشانہ بنایا[۳] لیکن شاہ غلام علی کے مندرجۂ بالا بیان کی موجودگی میں اس بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا، شاہ صاحب صرف یہی نہیں کہ میرزا صاحب کے اعاظم خلفا میں سے ہیں بلکہ ان دنوں میرزا صاحب کے پاس موجود تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس واقعہ کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے،

میرزا صاحب عالم درد و کرب میں لوٹتے تھے اور اپنے ہی یہ اشعار پڑھتے تھے،[۴]

بنا کردند خوش رسمی بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سیل خون از سینہ گرمم رواں کردست عشق
نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخم دل مظہر مبادا بہ شود ہشیار باش
کایں جراحت یادگار ناوکِ مژگان اوست

جای رحم ست ای ہجوم آہ وای سیلابِ اشک
یادگار از من ہمیں مشتِ غباری ماندہ است

شگاف از ہای شک نشان سبحہ می باشد
دل مجروح می دانم کہ راہی با خدا دارد

لیکن مصحفی لکھتے ہیں کہ مندرجۂ ذیل شعر ان کی زبان پر جاری تھا،[۵]

۱؎ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۷۱؛ ۲؎ میرزا علی لطف: گلشن ہند، ص ۱۰۷؛ ۳؎ قدرت اللہ گوپاموی: نتائج الافکار، ص ۵۔۷؛ ۴؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی؛ معمولات مظہریہ، ص ۱۴۰؛ ۵؎ مصحفی عقد ثریا، ص ۵۶،

چہ خوش بروی دل تنگ مادری وا کرد　　　خدا دراز کند عمر زخم کاری ما

ممکن ہے کہ جس شعر کا مصحفی نے ذکر کیا ہے وہ بھی میرزا صاحب کی زبان پر جاری رہا ہو اور مولوی نعیم اللہ اسے لکھنا بھول گئے ہوں،

تقریباً گھنٹے بھر بعد جب کچھ سکون ہوا تو فرمایا کہ الحمد للہ جد بزرگوار (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کی ایک سنت پوری ہوئی لیکن ابھی دوسری باقی ہے، خدا اپنے فضل عمیم سے اسے بھی پوری کر دے کیونکہ یہ میری دیرینہ تمنا ہے[1]، یعنی جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے زخم لگنے کے تین دن بعد وفات پائی اُن کی وفات بھی تین دن بعد ہو۔

کہتے ہیں کہ بادشاہ (شاہ عالم) نے میرزا صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ ہم نے مفسدوں کی تلاش کروائی لیکن کچھ پتا نہ چلا، آپ کچھ سراغ بتائیں تاکہ ان کو تلاش کر کے قرار واقعی سزا دی جائے، میرزا صاحب نے جواب میں کہلایا کہ فقرا تو شہید راہ خدا ہیں، مرے ہوؤں کو مارنے کا قصاص کیا۔ اور اگر اتفاق سے مجرم ہاتھ آجائیں تو انھیں میرے پاس بھیج دیا جائے تاکہ دستور طریقت کے مطابق ان سے بدلہ لیا جائے[2]، یعنی میرزا صاحب انھیں معاف کر دیں،

آں کشتۂ تیغ حق محبت ادا نہ کرد　　　کز بہر دست و بازوی قاتل دعا نکرد

ذوالفقار الدولہ نواب نجف خان نے معالجہ کے لئے جراحان فرنگ (ڈاکٹر) کو (میرزا مظہر کی) خدمت اقدس میں بھیجا، میرزا صاحب نے کہلا بھیجا کہ اگر زندگی باقی ہے تو مسلمان جراحوں کے ہاتھ سے شفا ہو جائے گی اور اگر وقت پورا ہو چکا ہے تو ان کافروں کا احسان مرتے وقت کیوں اٹھاؤں[3]؟

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی: معمولات مظہریہ، ص ۱۴۰، [2] ایضاً [3] ایضاً، ص ۱۴۱،

زندگی بی منت ار آید میسر بگ نیست ہمتش نازم کہ ممنونِ مسیحائی شود
(میرزا مظہر)

صاحب مقامات مظہری کا بیان ہے کہ ضعف بڑھتا گیا اور اس حد تک بڑھا کہ آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی، تیسرے دن جمعہ کے روز صبح کی نماز کے بعد مجھ سے کہا کہ میری ۱۱ نمازیں قضا ہو چکی ہیں، لیکن کیا کروں میرا سارا جسم خون آلود ہے، اور مجھ میں سر اٹھانے کی بھی طاقت نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اگر مریض سر بھی نہیں اٹھا سکتا تو اسے نماز موقوف کر دینی چاہیئے، اشارہ سے نماز نہ پڑھے، تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مسئلہ وہی ہے جو آپ نے فرمایا، آدھا دن گذر جانے کے بعد انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کچھ دیر فاتحہ پڑھی، عصر کے وقت میں پھر خدمت میں حاضر تھا، پوچھا کہ ابھی کتنا دن باقی ہے؟ میں نے عرض کیا چار گھڑی، فرمایا ابھی مغرب میں دیر ہے، مغرب کی نماز کے وقت شب شنبہ ۱۰ محرم الحرام تین بار زور زور سے سانس لیا اور روح مبارک عالم جاودانی کو پرواز کر گئی، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء[1]،

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ۱۰ محرم الحرام کو میرزا صاحب کا تابوت مبارک اور تعزیہ ساتھ ساتھ اٹھے اور تمام دوست احباب ماتم کناں جنازے کے ساتھ تھے، یہ پتا نہ چل سکا کہ نماز جنازہ کہاں پڑھی گئی اور کس نے پڑھائی، بہرحال نماز جنازہ کے بعد حضرت بی بی صاحبہ (زوجۂ میرزا صاحب) کی حویلی میں جو چتلی قبر کے متصل ہے دفن ہوئے[2]،

میرزا صاحب نے اپنے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۰،۷ [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۴۰ [3] ایضاً

"منکوحۂ من از من درخواست کردہ بود کہ تدبیر امور اخروی خود را برای او وا گذارم ... من ہم ایں معنیٰ را باقرار زبانی قبول کردہ بودم، اما دراں ایام مستورہ قطعۂ زمینی در ملک خود نہ داشت، الحاصل یک منزل حویلی خرید کردہ است و من بجاں از آں بقعہ بیزارم، اگر خواہد کہ مرا در انجا مدفون سازد بر دوستانِ فقیر بحکم حق دوستی واجب است کہ ہرگز تجویز نہ نمایند بعد ازیں ہر جا کہ میسر آید مرضیٔ او مرعی دارند و بیرون ترکمان دروازہ مناسب تر است"[1]

اتنی واضح اور پُر زور وصیت کے باوجود میرزا صاحب کا مدفن وہیں بنایا گیا، جہاں وہ نہیں چاہتے تھے، اس کی توجیہ مولوی نعیم اللہ نے یہ کی ہے:

(۱) وصیت نامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے پاس تھا،

(۲) بی بی صاحبہ کی حویلی میں ان کو اس نیت سے دفن کیا گیا تھا کہ وصیت نامہ دیکھنے کے بعد وصیت کے مطابق منتقل کر دیا جائے گا،

(۳) وصیت نامہ دیکھنے کے بعد جب منتقل کرنے کا ارادہ کیا گیا تو میرزا صاحب نے عالم معاملہ میں منع فرمایا[2]،

مزار کی تعمیر

(مولوی) نعیم اللہ بہرائچی نے معمولات مظہریہ کے تکملے میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں مجھے میرزا صاحب کے مزار مبارک کی تعمیر کی غرض سے شاہ جہان آباد کے سفر کا اتفاق ہوا[3]، پھر بشارات مظہریہ میں وہ اپنے خواجہ تاش (مولوی) عبد الباقی کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "اس سال میں مزار مبارک کی تعمیر سے فراغت حاصل کر کے لکھنؤ لوٹا[4]، بشارات

۱؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۴۳-۱۴۴ ۲؎ ایضاً، بشارات مظہریہ ق ۱۴۵ ب ۳؎ ص ۱۴۴-۱۴۳ ۴؎ ق ۱۸۲

مظہریہ کے خاتمے پر "ختم تحریر کتاب" کی تاریخ ۱۰ محرم الحرام ۱۲۰۷ھ ہے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مزار کی تعمیر ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۱ء اور ۱۲۰۶ھ / ۹۲-۱۷۹۱ء کے درمیان ہوئی اور (مولوی) نعیم اللہ بہرائچی کی کوشش سے ہوئی۔

کتبہ:

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ میرزا صاحب کے لوحِ مزار پر ان کا مندرجۂ ذیل شعر کندہ کرایا گیا۔

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریری		کہ ایں مقتول را جز بی گناہی نیست تقصیری

اس کتاب کی پہلی اشاعت کے بعد مؤلف کو جناب مولانا ابوالحسن زید صاحب فاروقی سجادہ نشین درگاہ شاہ ابوالخیر (چتلی قبر، دہلی) سے بمبئی میں ملنے کا شرف حاصل ہوا، باتوں باتوں میں میرزا صاحب کے کتبے کا ذکر آگیا، انھوں نے فرمایا کہ لوحِ مزار پر کتبہ کبھی نہیں تھا، بلکہ مزار کے دروازہ پر تھا، انھیں کے ایک خط سے پتہ چلا کہ "یہ کتبہ ۱۳۴۵ھ یا ۱۳۴۶ھ میں آندھی کی وجہ سے گر کر قطعہ قطعہ ہوگیا تھا" اور انھوں نے تقریباً ۳۰ سال کے بعد..... اسی ڈھب کا کتبہ ۲۱ جمادی الآخر ۱۳۸۲ھ (۲۰ نومبر ۱۹۶۲ء) کو دروازے کے اوپر پھر لگوا دیا۔[1]

صاحبِ تذکرۂ مسرت افزا نے (مولوی) جان محمد ناتواں کی زبان سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ میرزا صاحب کی وفات کے بعد ان کے بعض دوستوں نے ان کا دیوان اس نیت سے کھولا کہ جو شعر سرِ صفحہ نظر آئے اسی کو ان کے مزار پر کندہ کرایا جائے، چنانچہ مندرجۂ بالا شعر نکلا۔[2]

---

[1] مکتوب مولانا ابوالحسن زید صاحب فاروقی بنام افتخار احمد صاحب جھنجھانوی، مورخہ ۵ مارچ ۱۹۶۳ء،

[2] بحوالۂ معاصر، پٹنہ، ج ۲، حصہ ۷،

مصحفی کے بیان سے بھی اس روایت کی تائید ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد ان کے ایک نیاز مند نے فال لینے کے لئے ان کا دیوان کھولا تو یہ شعر (مذکورۂ بالا) نکلا،

سالِ وفات:

بعض تذکرہ نویسوں نے میرزا صاحب کا سال وفات ۱۱۹۴ھ اور چند نے ۱۱۹۲ھ لکھا ہے، میرزا صاحب نے ۱۱۹۵ھ کے بالکل شروع میں (۱۰ محرم الحرام) وفات پائی، اس لئے ۱۱۹۴ھ تو قرین قیاس ہو سکتا ہے، لیکن ۱۱۹۲ھ کو کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا، ۱۱۹۴ھ تک کے تمام تذکروں میں میرزا صاحب کا ذکر ایک ہم عصر شاعر کی حیثیت سے آتا ہے، یہ تذکرے چونکہ ان کے ہم عصروں کے لکھے ہوئے ہیں، اس لئے بہ نسبت بعد کے تذکرہ نگاروں کے زیادہ قابل اعتماد اور مستند مانے جائیں گے، اس کے علاوہ میرزا صاحب کی شہادت پر ان کے متعدد ہم عصروں، شاگردوں اور مریدوں نے تاریخیں کہی تھیں، ان تمام تاریخوں سے ۱۱۹۵ھ (چند سے ۱۱۹۴ھ) نکلتا ہے، نیچے چند اچھی اور مشہور تاریخیں نقل کی جاتی ہیں،

تمام تاریخوں میں قمرالدین منت کی تاریخ زیادہ مشہور اور پسندیدہ ہے، اس تاریخ کا مادہ خاص الفاظ حدیث ہیں،

ہست حدیثی از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم — عاش حمیداً مات شہیداً سالِ وفاتِ مرزا مظہر
۱۱۹۵ھ

آزاد بلگرامی نے میرزا صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہار یوں فرمایا:

میرزا مظہر سخن سنجِ شہید — حشر او با نور چشمِ فاطمہ
روز عاشورہ از جہاں مظلوم رفت — گفتہ شد تاریخ حسن الخاتمہ
۱۱۹۵

سودا نے اپنے درد و غم کا اظہار اس طرح کیا:

مظہر کا ہوا قاتل اک مرتد شوم — اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ وفات ان کی کہی بار دے درد   سودانے کہ اے جان جاناں مظلوم
۱۱۹۵ھ

میرزا صاحب کا قاتل

تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ میرزا صاحب کو ایک شیعہ نے مارا، لیکن مولانا محمد حسین آزاد کی رائے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"قتل کا سبب دلی کے خاص و عام میں مشہور تھا کہ بموجب رسم کے ساتویں کو علم اٹھے تھے، یہ (میرزا صاحب) سر راہ اپنے بالاخانے پر خاص خاص مریدوں کو لئے بیٹھے تھے، جیسا کہ عوام جہلا کی عادت ہے شاید طرفین سے کچھ طعن و تعریض ہوئے ہوں، وہ کسی جاہل کو ناگوار ہوئے، ان میں کوئی سنگ دل فولاد خاں نام سخت جاہل تھا، اس نے یہ حرکت کی، لیکن قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ میرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علیؑ کی مدح میں کہا کرتے تھے۔ اس پر بگڑ کر کسی سنی نے یہ حرکت کی۔"[1]

اس کے بعد مولانا آزاد حاشیے میں لکھتے ہیں:

"عجب مشکل ہے، حکیم صاحب بھی ایک خوش اعتقاد سنت جماعت تھے، وہ کہتے ہیں کہ سنی نے مارا، لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا۔"[2]

حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد کو تسامح ہوا، حکیم صاحب کی اصل عبارت یہ ہے۔

ازاں جا کہ مشرب صافی و مذہب اہل حق بوی ارزانی داشتہ بود ظالمی ناحق شناس در ایام متبرکہ عاشورہ بہ تعصب مذہب بی حقیقت کار نابردہ کہ دمی عزیق حب جناب ولایت مآب و حریق عشق حضرت امامت انتساب مرتضوی بود،

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات، ص ۱۴۴ [2] ایضاً

سلام اللہ علیہ وکرم اللہ وجہہ چنانچہ بعضی از اشعار آبدارش خاصہ ایں بیت،

نہ کرد مظہر ما طاعتی و رفت بخاک   نجات خود بتولای بو تراب گذاشت

بربے گناہیش گواہی دہد، بے گناہ شہید ساختہ بہ حضور سراپا سرور شہدای کربلای معلا علیہم السلام والرضوان رسانید[1]"

مندرجۂ بالا عبارت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی نے یہ معلوم کئے بغیر کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت میں کس قدر غرق ہیں، ان کو شہید کر دیا، یہ نہیں لکھا ہے کہ چونکہ وہ حضرت علیؑ کی مدح میں اشعار کہا کرتے تھے اس لئے کسی سنی نے انھیں مارا،

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرزا صاحب کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نیاز خصوصی تھا، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ

"... نسبت ما بجناب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ می رسد و فقیر را نیازی خاص بآں جناب ثابت است، در وقت عروض عارضۂ جسمانی توجہ بآں حضرت واقع می شود و سبب حصول شفامی گردد[2]"

اشعار میں بھی تولائے علی کے اشارے پائے جاتے ہیں، مثلاً مندرجۂ بالا شعر کے علاوہ یہ اشعار:

مژدہ مظہر سرمہ از خاک نجف آوردہ ام   کاروان ما بیار ایں بار نور آوردہ است

مقطع ایں غزل افتاد چو مشکل مظہر   مدد قافیہ ام شاہ نجف کرد آخر

علی کے نانو کی تسبیح ورد کر منگا   ہزار شکر کہ دانا امام پایا ہے

خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ "یک بار قصیدہ ای کہ مطلع اینست:

---

[1] قدرت اللہ قاسم: مجموعہ نغز جلد دوم ص ۱۹۹، [2] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۸،

فروغ چشم آگاہی امیرالمومنین حیدر ترا انگشت یداللّٰہی امیرالمومنین حیدر

بجناب ایشاں عرض نمودم تو از شہا فرمودند[1]"

جہاں تک میرزا صاحب کے قاتل کا تعلق ہے تمام ترجمے اور تذکرے خواہ وہ میرزا صاحب کے مریدوں نے لکھے ہوں یا غیروں نے، سنیوں نے لکھے ہوں یا شیعوں نے، بلا استثنا اس بات پر متفق ہیں کہ وہ شیعہ تھا، مثلاً مولوی نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ

"از دست ناحق پرستاں بے دولت شیعی زخم گولی طپنچہ بر سینۂ مبارک رسیدہ[2]"

قدرت اللہ قاسم کا بیان اوپر نقل کیا جا چکا ہے، ان کی بھی یہی شہادت ہے، مصحفی بھی میرزا صاحب کے عہد میں موجود تھے، اس لئے ان کا بیان بھی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ،

"در عہد شاہ عالم بادشاہ کہ بہ سبب بودن امیر الامرا، ذوالفقار الدولہ بہادر در دہلی علوی اہل تشیع بیشتر بود و ایں بزرگ (میرزا مظہرؒ) مقتدای متعصبانِ اہل سنت وجماعت گفتہ می شد، شخصی از متعصبانِ اہل تشیع شب ہفتم محرم الحرام یک ہزار و صد و نود و پنج او را بگولۂ طپانچہ مجروح ساخت[3]"

مقتدای متعصبانِ اہل سنت وجماعت کو کوئی سنی کس طرح قتل کر سکتا ہے؟ صاحب سفینۂ ہندی بھی میرزا صاحب کے زمانے میں موجود تھے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف ان کو حاصل تھا، ان کا بیان یہ ہے کہ "ہر چند کہ (میرزا صاحب) می گفت کہ ما را با مذہب کاری نیست کہ ما محمدیم اما در مذہب سنت وجماعت غلو داشت[4]"

---

[1] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۸، [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۴۰
[3] مصحفی: عقد ثریا، ص ۵۵ [4] بھگوان داس: سفینۂ ہندی (قلمی)

مذہب سنت و جماعت میں غلو رکھنے والے بزرگ کا قاتل کوئی سنی نہیں ہو سکتا،
مبتلا میرٹھی کہتے ہیں کہ "در دورۂ نواب نجف خاں۔۔۔ بہ سبب اختلاف مذہب از دست،
شخصی شیعہ بضرب طپانچہ رتبۂ شہادت یافت"[1]

اب اس کے بعد دو شیعہ حضرات کا بیان بھی سن لینا چاہئے، علی ابراہیم گلزار
ابراہیم میں لکھتے ہیں، "گویند بہ سبب تعصب مذہب منع تعزیۂ سید الشہدا علیہ السلام می نمود،
بدیں حمیت زدستِ یکے از ساکنان دہلی در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری کہ
عمرش قریب صد بود مقتول شد"[2]

علی لطف کا بیان ہے کہ

"کہتے ہیں کہ ہفتم[3] روز عاشورہ کو لب بام یہ اپنے گھر میں سر راہ بیٹھے تھے ناگاہ گذر
شندوں کا ان کے زیر بام سے ہوا، میرزا صاحب۔۔۔ متبسم ہو کر فرمانے لگے کہ
بارہ سَو برس جس مقدمہ کو ہو چکے ہوں ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت نہیں ہے؟
اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے، یہ گفتگو بجنسہٖ وہ لوگ
جو کہ علم اور شندوں کے ساتھ تھے، انھوں نے سنی اور تعصب کی مرزائے مذکور
کے امام باڑوں اور محفلوں میں دو تین روز گفتگو رہی، آخر شب شہادت کو
کہ شب دہم عاشورہ ہے، کوئی شخص ان کے دروازہ پر آیا اور ان کو باہر
بلوایا، جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچہ کی نذر کی اور کام ان کا پورا
کرکے راہ اپنے گھر کی لی، سن بھی ان کا قریب سَو برس کے تھا، ایسا زخم کاری

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن؛ تذکرۂ طبقات سخن (مطبوعہ ہماری زبان جلد ۱۹ شمارہ ۱۰) بحوالہ مبتلا میرٹھی،
طبقات سخن قلمی، [2] علی ابراہیم، گلزار ابراہیم بحوالہ گلشن ہند ص ۱۱۲، [3] یہ تاریخیں صحیح نہیں،

کھایا لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا، ۱۱۹۴ھ تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینۂ زنگار آلودہ دنیا سے منہ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین رضؓ کے منازل طریقت پر کیا۔[1]

شہادت کی بالکل یہی وجہ کریم الدین نے بھی اپنے تذکرۂ شعرا میں عبدالحیٔ تاباں کی زبانی بیان کی ہے، حالانکہ تاباں کا انتقال خود میرزا صاحب کی زندگی ہی میں ہوچکا تھا، ان کا سال وفات بقول مولوی عبدالحق ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہے۔[2]

میرزا صاحب کی شہادت ایک سیاسی واقعہ:

میرزا صاحب کی شہادت بقول حافظ محمود شیرانی "ایک سیاسی واقعہ معلوم ہوتا ہے"[3] اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ملک میں شیعیت کا زور بڑھنے لگا، بہادر شاہ اول کے بعد شیعوں کا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ دو بھائی سید عبداللہ اور سید حسین سلطنت کے مالک کل بن گئے اور بادشاہ گر کے لقب سے مشہور ہوئے، بالآخر محمد شاہ کے عہد میں وہ قتل ہوئے، لیکن محمد شاہ ہی کے زمانے میں جب تورانی پارٹی کا زور ٹوٹا اور ایرانی پارٹی برسر اقتدار آئی تو شیعیت نے پھر زور پکڑا، شاہ عالم نے انگریزوں کی سفارش پر نجف خاں کو میر بخشی بنایا، نجف خاں کا دہلی آنا تھا کہ شیعیت نے بے انتہا زور پکڑا اور سنیوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے جانے لگے، میرزا مظہر ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "حال مردم ایں شہر از روز یکہ نجف خاں

---

[1] علی لطف، گلشن ہند، ص ۱۰۱۔ [2] دیوان تاباں مقدمہ از مولوی عبدالحق، ص ۷۔ [3] تنقید بر آب حیات، اورنٹیل کالج میگزین لاہور، جلد ۱۸ نمبر ۱

آمدہ است، از شاہ تا گدا تباہ است[۱]۔"

میرزا صاحب بقول مصحفی "مقتدای متعصبانِ اہل سنت و جماعت" تھے، اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان کے مریدوں میں روہیلوں کی اکثریت تھی جو سیاسی طور سے نجف خاں کے سخت ترین دشمن تھے، اس لئے اس کے اشارے سے میرزا صاحب کا قتل ہوا اور اس نے حد جاری کرنے سے تغافل برتا[۲]۔ عشقی عظیم آبادی کا بھی بیان ہے کہ "در عہد دولت نجف خاں بہادر بعضی از مغل بچہ ہا افواج نواب مرقوم آں جوہر کامل را باہتمام تعصب بہ تیغ بے دریغ از ستم گذرانند[۲]۔" خلیل السہرندی کے بیان کے مطابق شیعوں نے اس مقصد کے لئے ہمشیرۂ نجف خاں کو آمادہ کیا اور اسی کے ایما سے میرزا صاحب کو شہید کیا گیا[۳]۔"

اعزہ و متعلقین

میرزا صاحب کے اعزہ و متعلقین کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں، ان کے مکتوبات میں 'متعلقان' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے بظاہر صرف ان کی اہلیہ مراد ہیں، میرزا صاحب کے والد کے حالات کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے کہ جب انھوں نے فقیری لے لی تو اپنا سارا اثاثہ راہ خدا میں تقسیم کر دیا، صرف پچیس[۲۵] ہزار روپئے لڑکی کی شادی کے اخراجات کے لئے رکھ چھوڑے تھے اور بعد میں اس کو بھی ایک دوست کی نذر کر دیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب کے ایک بہن تھیں، اس کے علاوہ میرزا صاحب کا یہ بیان بھی ملتا ہے:

---

[۱] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۶۲ [۲] دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد،
[۳] تراجم مشائخ المذکورین فی السلسلۃ المجددیہ،

"لڑکپن میں میں نے اور میری بہن نے فرط محبت سے یہ عہد کیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ ہم میں سے جو پہلے دنیا سے کوچ کرے گا، دوسرا اس کی پیروی کرے گا یعنی اپنے آپ کو ہلاک کرے گا، جب میری بہن کا آخری وقت آ پہنچا تو انھوں نے میری طرف نگاہ کی، میں نے کہا کہ میں ایفائے عہد کے لئے ثابت قدم ہوں، ایک ضرب کٹار سے کام تمام ہوجائے گا، لیکن اس صورت میں میرا اور آپ کا ملاپ مشکل ہے کیونکہ آپ کو "النفساء شہید" کے حکم کے مطابق شہدا کے قافلے کے ساتھ جنت کے راستے لے جائیں گے، اور مجھے حرام موت کی وجہ سے دوسرے راستے سے، ناچار میں نے اپنی چادر کو کفن کے مانند بنا لیا، اور اپنے جسم پر لپیٹ لیا، اور کہا، موتوا قبل ان تموتوا، میں اپنے ظاہر کو مردہ دار بنا کر آپ کی رفاقت کرتا ہوں، کیونکہ زندگی کا اصل مقصد حظوظ نفسانی حاصل کرنا ہے اور وہ میں اپنی بہن پر قربان کرتا ہوں۔"[۱]

غالباً میرزا صاحب کی یہی بہن ہیں جن کے صاحبزادوں کی سفارش وہ انتظام الدولہ سے ان الفاظ میں کرتے ہیں، "فقیر ہمشیر زادہا دارم، ہر چند کمالاتے ندارند خالی از آدمیت نیستند، امابا قتضای زمانہ پریشان روزگار واقع شدہ اند، خصوصاً یکے از آنہا بحالت اضطرار گرفتار است۔"[۲]

متاہلانہ زندگی :-

میرزا صاحب کی متاہلانہ زندگی کچھ خوشگوار نہ تھی، ان کی شادی کس خاندان میں ہوئی تھی، اس کا پتہ نہ چل سکا، (مولوی) نعیم اللہ بہرائچی کے بیان کے مطابق انھوں نے آخر عمر میں شادی کی تھی[۳]، یہ بی بی طبعاً بد مزاج تھیں اور پھر آگے چل کر ان کو جنون کا

۱؎ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۳۸، ۲؎ کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب مکتوب ششم، ص ۵۵، ۳؎ بشارات مظہریہ، ق ۱۱ ب۔

عارضہ بھی ہو گیا تھا، مصنف مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرزا صاحب نے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کو وصیت کی تھی کہ ہم نے بتیس سال یا اس سے بھی زیادہ ان کی (حرم محترم کی) نازبرداری کی ہے، ہمارے بعد تم بھی انکی نازبرداری کرنا۔[1] میرزا صاحب نے تقریباً اسی سال کی عمر میں وفات پائی، اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ساٹھ، باسٹھ سال کی عمر میں شادی کی ہوگی،

شادی کی وجہ اور بیوی کی آتش مزاجی سے متعلق (مولانا) رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں کہ،

"ایک عورت تھی نہایت بدمزاج، کج خلق، منہ پھٹ، حضرت میرزا کو الہام ہوا کہ اگر اس عورت سے نکاح کرو اور اس کی بدمزاجی اور ایذا دہی پر صبر کروگے تو تم کو نواز لیا جائے گا، حضرت نے فوراً پیام بھیج دیا اور اس سے نکاح کر لیا، وہ عورت اس درجہ تند خو، بدخصلت، سخت دل اور فحش گو تھی کہ الاماں، حضرت میرزا صاحب خوشی خوشی دولت خانہ تشریف لے جاتے اور وہ بڑی بڑی سناتی شروع کرتی، چپکے چپکے بیٹھے سنتے رہتے، زبان سے اف نہ نکالتے، اندر گھولتے، آخر واپس تشریف لے آتے تھے، آپ کا معمول تھا کہ روزانہ صبح ہوتے ہی خادم کو حکم دیتے کہ جاؤ دروازہ پر حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرو اور پوچھو کوئی کار خدمت ہو تو انجام دیا جائے، بموجب ارشاد خادم آستانہ پر حاضر ہوتا اور شیخ کا سلام پہنچا کر مزاج پرسی کرتا، وہ نیک بخت بجائے جواب سلام گالیاں سناتی اور وہ مغلظات سناتی تھی کہ سننے والے شرما جاتے تھے، مگر میرزا صاحب کی خادم کو تاکید تھی کہ دیکھو، اہلیہ کی شان میں گستاخی نہ ہونے پائے، کسی بات کا جواب مت دینا، جو کچھ فرمادیں سن لینا..

---

[1] بشارات مظہریہ، ق، ۱۶۷ ب،

حضرت میرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اس عورت کا نہایت مشکور اور احسان مند ہوں، اس کے باعث مجھے نفع پہنچا ہے، اور حقیقت میں اس کے شدائد اور سختیوں کو برداشت کرتے کرتے حضرت میرزا صاحب کے اخلاق غایت درجہ مہذب ہوگئے اور آپ کا سب غیظ و غضب فرو ہوگیا تھا۔[1]

متعدد مکاتیب میں میرزا صاحب نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مردم محل سے جھگڑا ہی جان عذاب میں ہے، میں دہلی سے بھاگ جانا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ،، مثلاً ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں کہ "از دست مردم محل کہ دریں ایام تشویش و تنگ دستی و مقروضی سودائی ایشاں در جوش است، بجاں آمدم"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں وہ رقم طراز ہیں "فقیر با ایں دلی خفقان دوراز یں مردم نفس چند کہ باقیست بآرام خواہم زیست"[3] ایک خط میں وہ کتنی حسرت سے لکھتے ہیں، "خدا میسر آرد کہ چند روز از شور و شر سودائیاں بیاسائیم"[4]

میرزا صاحب کی اہلیہ کی کچھ جائداد تھی، یہ بھی ان کے لئے دردسر کا باعث تھی، اسی جائداد کی خاطر ایک بار انھیں اپنی قدیم وضع یعنی توکل کے خلاف مجدالدولہ عبدالاحد خاں کی مدد لینی پڑی، ایک مکتوب میں وہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھتے ہیں: "امروز تا فردا پروانہ دیہ را پیش عبدالاحد خاں روانہ می کنم خلاف رسم قدیم یعنی توکل ساز گار با ماند"[5]

لیکن میرزا صاحب نے تصویر کا دوسرا رخ بھی مکتوبات میں دکھایا ہے، جس سے ان کی انصاف پسندی اور وسعت قلب کا ثبوت ملتا ہے، جب کبھی مردم محل سنجیدہ حالت

---

۱ محمد عاشق علی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۶۱ ۲ عبدالرزاق قریشی، مرتبہ، مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۵۵، ص ۵۱، ۳ ایضاً مکتوب ۴۶، ص ۴۵ ۴ ایضاً مکتوب ۳۴، ص ۴۰ ۵ مکتوب ۱۰۱، ص ۵۳-۱۵۲،

میں ہوتیں تو ایک نیک باشعور اور خدمت گذار بیوی کی طرح رہتیں، مثلاً

"مردم محل در آدمیت کفارۂ عمرِ گذشتہ می دہند، خدا تعالیٰ بریں وضع استقامت کرامت نماید"[1]

"مردم محل باوجود ضیقِ معیشت بر سر آدمیت اند"[2]

"مردم محل کہ از چند روز بسیار موالفقت و متابعت می کنند، در ماہ رجب ارادۂ آں طرف دارند"[3]

مردم محل کی مزاجی کیفیت سے پریشان رہنے کے باوجود میرزا صاحب نے ہمیشہ ان سے اچھا سلوک کیا، اور مفارقت شرعی کا کبھی خیال نہ کیا، وہ اپنے مقدور بھر ان کا حق ادا کرتے، ان کی تکلیف اور بے بسی پر تڑپتے اور افسوس کرتے، مکاتیب میرزا مظہرؒ کے کئی مکتوبات میں اس کا اظہار ملتا ہے، مثلاً مولوی احمد اللہ کو لکھتے ہیں کہ "فقیر از بے اطاعتی و شوخی و نافرمانی و زیادہ طلبی، و بد گمانی و بد زبانی مردم اندروں بجاں آمدہ ام، صبر می کنم و نفقۂ زیادہ از واجب می رسانم و مفارقت تجویز نمی کنم"[4] قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو ارقام فرماتے ہیں: "ظاہر است کہ شخصی کہ حق واجبی بر من دارد و آبروی من باو متعلق است، اورا بہ بے کسی واگذاشتہ کجا خواہم رفت"[5]، وصیت نامے میں رقم فرمایا کہ "ایں مستورہ بنا بر عارضۂ سوداد در طول عمر ناسزا بسیار با فقیر کردہ، چنانچہ از اعزہ مخفی نیست، اما از آں ہمہ عفو کردم"[6]

میرزا صاحب اپنے مخصوص مریدوں کو بھی ان کی دلجوئی اور خدمت کی تاکید کیا کرتے

---

[1] عبد الرزاق قریشی، مرتبہ، مکاتیب میرزا مظہرؒ، مکتوب ۴، [2] ایضاً، مکتوب ۱۰۲، [3] ایضاً، مکتوب ۱۳۹۔

[4] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ، قلمی ق ۱۰۹ [5] عبد الرزاق قریشی، مرتبہ، مکاتیب میرزا مظہرؒ، مکتوب ۴۵ [6] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۴۴۔

تھے اور ان کی خدمت پر خوشی کا اظہار فرماتے۔ مثلاً محمد مراد کو بیرون دہلی سے لکھتے ہیں کہ
خدا شمارا ہزار سال زندہ دارد کہ بدسلوکی مردم محل بپاس خاطر فقیر تحمل می کنید و مقدمہ
را باصلاح می آرید، باید کہ از نیک و بد اندرون غافل نباشید تا فقیر دراین جا بر بیت طالبان
خدا مشغول باشم[1]۔" اسی طرح حکیم محمد فاروق کو کہیں سے لکھتے ہیں: "باید کہ شما موافق گفتہ
فقیر بر سر ڈیوڑھی حاضر شدہ تسکین و تسلی می کردہ باشید و خدمتی اگر فرمایند... نظر بحقوق
فرزندی داشتہ... بتقدیم خواہید رسانید[2]۔"

مردم محل کو جنون کا عارضہ شادی کے چند سال بعد ہوا کیونکہ اول تو جنون کی حالت میں
نکاح نہیں ہو سکتا تھا اور دوسرے میرزا صاحب کے ایک مکتوب میں جو انھوں نے
قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھا تھا، یہ واضح بیان ملتا ہے:

"مردم محل از غلبۂ نسبت طریقہ کہ از مدتی در اخذ توجہ ہر دو وقت التزام کردہ اند،
مزاج ایشاں تغیر یافتہ در انقطاع از دنیا و اقبال با آخرت و محبت خدا و رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترقیات نمایاں معلوم می شود و زندگی صوفیانہ و دوام کمال
متابعت می کنند و آثار غدر و فریب معلوم نمی شود[3]۔"

صاحب مقامات مظہری کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

"عفت پناہ، عصمت دستگاہ، زوجۂ شریعت حضرت ایشاں طریقہ از آن حضرت
گرفتہ بہ یمن مبارک بمرتبۂ حضور و آگاہی رسیدند و اجازت ارشاد نساء صالحہ
یافتہ تاثیر گرم در دلہا می نمودند، واقعات و مبشرات نیک می دیدند حضرت ایشاں
می فرمودند کہ ایشاں را عارضہ سوداالاحق گشت و غلبۂ جنون عقل را مستور ساخت،

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، م، ہشتاد و پنجم، [2] ایضاً م ہشتاد و نہم [3] ایضاً م ہشتاد و یکم،

موافقت بافقیر کم کردند، لہذا در باطن ایشاں فتوری نمایاں راہ یافت و آں
تاثیر دگرمیہا ی نسبت باطنی مختفی گشت[1]

میرزا صاحب کی وفات کے بعد بی بی صاحبہ پانی پت چلی گئیں، وہاں وہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے دولت کدے پر رہی تھیں اور قاضی صاحب نے میرزا صاحب کی وصیت کے مطابق ان کی خدمت اور خاطر داری و ناز برداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا،[2] میرزا صاحب کی زندگی میں بھی وہ کبھی کبھی پانی پت جایا کرتی تھیں، مکاتیب میرزا صاحب میں اس کا ذکر ملتا ہے، مثلاً ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں کہ "پس فردا کہ بیست و ہفتم ماہ محرم است، رخصت مردم محل بجانب پانی پت موافق درخواست ایشاں قرار یافتہ"[3] ان کا انتقال کب ہوا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ بشارات مظہریہ کے زمانۂ تالیف[4] تک وہ زندہ تھیں،

چونکہ میرزا صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ان کی اہلیہ نے اپنے ایک عزیز علی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا لیکن وہ نہایت نکما اور حریص آدمی نکلا، اس کے باوجود میرزا صاحب اسے اولاد کی طرح مانتے تھے کیونکہ وہ ان کی اہلیہ کو عزیز تھا،[5] اس کے دو لڑکے تھے، عبداللہ اور نظامی، وہ دونوں بھی نکمے ثابت ہوئے،[6]

خلفا:

شاہ غلام علیؒ کا بیان ہے کہ حضرت میرزا مظہر کے خلفا کی تعداد بہت بڑی تھی،[7] ان خلفا نے ہندوستان کے مختلف مقامات میں، خصوصاً شمالی ہند میں، طریقہ نقشبندیہ مجددیہ

---

[1] ص ۶۳ [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ، ق ۱۶۷ ب، [3] ایضاً، ق ۱۶۸، [4] ایضاً، ق ۱۶۹ ب [5] ق ۱۷۰، ۱ [6] مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۶۴،

مظہریہ کی اشاعت کی، انھوں نے اپنی تعلیم و تلقین سے اس عہد کے تباہ حال اور قنوطیت پسند مسلمانوں کی تقویتِ ایمان اور تالیفِ قلوب کا سامان مہیا کیا، نیچے چند خلفا کے مختصر حالات دیے جاتے ہیں،

قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتیؒ:

میرزا صاحب کے خلیفہ "اشرف و اسبق" ہیں[1]، وہ حضرت شیخ جلال کبیر اولیاء پانی پتیؒ کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے[2]، ان کے والد حبیب اللہ حضرت شیخ عابد سنامیؒ کے مرید تھے، خود قاضی صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شیخ نے بعد اجازت سب سے پہلے جس کو توجہ دی وہ میرے والد تھے[3]، قاضی صاحب نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا[4]، پہلے انھوں نے علمائے پانی پت سے تحصیل علوم کی، پھر دہلی آکر حضرت شاہ ولی اللہ سے فقہ اور حدیث میں درس لیا[5]، علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد انھوں نے حضرت شیخ عابد سنامی سے بیعت کی، اور پھر انھیں کے ارشاد کے مطابق حضرت میرزا مظہر کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادۂ باطنی کیا، اٹھارہ سال کی عمر میں علوم ظاہر و باطن سے فراغت پاکر اور خلافت طریقہ حاصل کر کے وہ خلق خدا کو فیض پہنچانے لگے[6]،

شاہ غلام علیؒ نے ان کے صفائی ذہن، جودت طبع، قوت فکر، سلامت طبع کو وصف و ستائش سے بالاتر کہا ہے، ان کی رائے میں قاضی صاحب علوم نقلی و عقلی میں تبحر رکھتے

---

[1] مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۵۰، [2] ایضاً [3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ ق ۱۴۶ ب [4] قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مالابد منہ، دیباچہ از محمد عبد الرحمٰن، ص ۴ [5] (مولانا) عبد الحی نزہۃ الخواطر، جلد ۷، ص ۱۱۳ [6] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۶۶۔

تھے اور فقہ اور اصول فقہ میں انھیں اجتہاد کا مرتبہ حاصل تھا[1]، خود قاضی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فقہ، حدیث، اور تفسیر میں رائے صائب عطا فرمائی ہے[2] میرزا صاحب نے انھیں علم الہدیٰ کا لقب دیا تھا[3]، اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ انھیں بیہقیٔ وقت کہا کرتے تھے[4]،

وہ اپنے فرائض منصبی (قضاءت) نہایت دیانت اور غیر جانبداری سے انجام دیتے تھے، اور کسی کے ساتھ کسی قسم کی رعایت یا تعصب نہیں برتتے تھے، اپنے وصیت نامے میں انھوں نے لکھا ہے کہ تقویٰ "ادای واجبات و ترک محرمات و مشتبہات سے عبارت ہے، نہ کہ کثرت نوافل واتیان مستحبات سے، ان کی اسی فرض شناسی اور دیانت کا نتیجہ تھا کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں میں مقبول تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے[5]، فرائض منصبی کے علاوہ ان کے وقت کا بیشتر حصہ عبادت و ریاضت، تدریس علوم ظاہر و باطن، مطالعہ و مباحثۂ علوم دینی اور تصنیف و تالیف میں گذرتا تھا[6]،

مولوی نعیم اللہ کے بیان کے مطابق میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولوی ثناء اللہ صلاح و تقویٰ کے لحاظ سے روح مجسم ہیں اور مروج شریعت منور طریقت ہیں، وہ ہر حال میں سنت نبوی کی پیروی کی کوشش کرتے تھے، پیروی سنت ہی کی نیت سے تقلیل طعام و تکثیر صیام، ان کا معمول تھا[7]، اپنے وصیت نامے میں بھی انھوں نے اپنے اعزہ اور احباب کو اس کی تاکید کی ہے، وہ تہجد کی نماز میں خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں، ایک منزل کی تلاوت

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۶۵ [2] ایضاً کمالات مظہری (قلمی) ص ۱۰۹، [3] ایضاً، مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۶۶ [4] قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مالابد منہ، دیباچہ از محمد عبدالرحمن ص ۴

[5] ایضاً وصیت نامہ، ص ۶۹-۷۰ [6] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ، ق ۱۲۰، [7] ایضاً،

کرتے تھے[1]، ان کی نماز وظیفہ سو رکعتوں پر مشتمل ہوتی تھی[2]، میرزا صاحب ان کے ظاہری و باطنی کمالات کی بنا پر انھیں عزیز ترین موجودات کہا کرتے تھے[3]۔ وہ اپنے پیر و مرشد کی نگاہ میں کس قدر عزیز تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تم ہماری بارگاہ میں کیا تحفہ لائے تو میں عرض کروں گا، ثناء اللہ پانی پتی[4]،

قاضی صاحب نے یکم رجب ۱۲۲۵ھ (۱۲ اگست ۱۸۱۰ء) کو وفات پائی، مولوی محب اللہ پانی پتی نے مندرجۂ ذیل آیت سے ان کی تاریخ وفات نکالی تھی!

فہم مکرمون فی جنت النعیم[5]

قاضی صاحب کی تصانیف کی تعداد تیس سے اوپر ہے، ان میں تفسیر مظہری دس جلدوں میں ہے اور خصوصاً اہم اور مشہور رہی ہے، اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے،

شاہ غلام علی:

پٹیالہ (پنجاب) میں ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) میں پیدا ہوئے، تاریخ ولادت 'مظہر وجود' سے نکلتی ہے ان کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے، ان کے والد شاہ عبداللطیف زاہد مرتاض تھے، وہ جنگلوں میں جاکر ذکر جہر کیا کرتے تھے[6]، خود شاہ صاحب نے انھیں عالم و حافظ قرآن بھی بتایا ہے[7]،

شاہ صاحب حافظ قرآن ہونے کے علاوہ علم و فضل میں بھی کمال کا درجہ رکھتے تھے،

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ، ق ۱۴۸، [2] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۱۰، [3] ایضاً، ص ۷۷، [4] ایضاً، [5] قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مالا بد منہ، دیباچہ، ص ۴، [6] شاہ غلام علی مقامات مظہری، ضمیمہ مقامات مظہری، ص ۱، [7] ایضاً، کمالات مظہری، قلمی، ص ۱۲۰۔

حدیث کی سند انھوں نے فرزندان شاہ ولی اللہ اور حضرت میرزا مظہرؒ سے لی تھی[1]۔ سنہ ۱۱ھ میں بائیس سال کی عمر میں میرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی، پندرہ سال کے بعد (میرزا صاحب کی شہادت سے کچھ ہی پہلے) انھیں اجازت مطلقہ حاصل ہوئی، وہ حدیث وتفسیر کا درس بھی دیا کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں کم وبیش دوسو آدمی رہا کرتے تھے[2]،

شاہ صاحب ہر روز صبح کے وقت دس سیپارے تلاوت کرتے، وہ پوری پوری رات ذکر اور مراقبے میں گذار دیتے، اگر نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو تھوڑی دیر مصلے ہی پر آرام فرما لیتے، ان کا عمل ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر تھا اور اس سلسلے میں وہ کبھی کسی سے خائف نہیں ہوئے، یہاں تک کہ بادشاہ وقت (اکبر شاہ ثانی) سے بھی احتساب کرنے میں انھیں باک نہ ہوا، رسول پاک سے محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی مضطرب ہو جاتے[3]،

وہ سنت نبوی کی پیروی میں لباس ہمیشہ گزی گاڑھے کا پہنتے تھے، ان کے مزاج میں حیا بہت تھی، بڑے سخی بھی تھے، مومنوں کے حال پر اس قدر شفقت تھی کہ اکثر رحلت کے وقت ان کے لئے دعا فرماتے، ان کی مجلس میں نہ دنیاوی باتیں ہوتیں اور نہ امرا کا ذکر ہوتا، غیبت سے انھیں سخت نفرت تھی[4]،

ان کی طبیعت میں تجرید وتوکل بہت تھا، بادشاہ وقت یا کسی امیر نے اگر کبھی کچھ دینے کی خواہش کی تو اکثر یہ قطعہ پڑھتے،

خاک نشینیِ ست سلیمانیم ننگ بود افسر سلطانیم
ہست چہل سال کہ می پوشمش کہنہ نہ شد خلعت عریانیم[5]

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ضمیمہ مقامات مظہری، ص ۳، [2] ایضاً ص ۲-۳ [3] ایضاً ص ۷-۴ [4] ایضاً ص ۵-۴
[5] ایضاً ص ۵،

وہ مالداروں کا بھیجا ہوا کھانا بھی نہیں کھاتے تھے بلکہ اہل حلقہ کو بھی اس کے کھانے سے منع فرماتے۔ اسے ہمسایوں اور اہل شہر میں سے جو اس وقت موجود ہوتے تقسیم کر دیتے[1]۔

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہماری جاگیر مواعید الٰہی ہے، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فقیر کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں: دست شکستہ، پای شکستہ، دینی درست، یقینی درست[2]،

شاہ صاحب کے ملفوظات میں ہے کہ لفظ فقیر میں "ف" سے فاقہ، "ق" سے قناعت، "ی" سے یاد الٰہی اور "ر" سے ریاضت مراد ہے، جس نے اس پر عمل کیا اسے فای فضل خدا قاف قرب مولیٰ، یای یاری اور رای رحمت، نصیب ہوئی۔ ورنہ فای فضیحت، قاف قہر، یای یاس اور رای رسوائی اس کے حصے میں آئی[3]

شاہ صاحب نے ۲۲ر صفر ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) کو انتقال فرمایا ان کا مدفن ان کے مرشد کے پہلو میں ہے، نور اللہ مضجعہ ان کی تاریخ وفات ہے،

شاہ صاحب نے حضرت میرزا مظہر کے حالات وفضائل اور معمولات وغیرہ میں دو کتابیں لکھی ہیں، مقامات مظہری اور کمالات مظہری پہلی چھپ چکی ہے، اور دوسری مخطوطے کی شکل میں ہے،

مولوی نعیم اللہ بہرائچی:

شاہ غلام علی نے انھیں، جامع علوم معقول ومنقول، کہا ہے۔[4] ۱۱۸۹ھ میں میرزا مظہر کے ایک خلیفہ محمد جمیل دہلی سے لکھنؤ آئے۔ مولوی نعیم اللہ نے تحصیل علم ظاہری سے فراغت

---

[1] شاہ غلام علی مقامات مظہری، ضمیمہ ص ۳ [2] شاہ غلام علی، ص ۵ [3] شاہ غلام علی، ص ۷، [4] شاہ غلام علی، ص ۱۶، مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۸۱،

حاصل کرلی تھی، اس لئے ان سے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ مظہریہ میں بیعت کی، پھر ۱۱۸۹ھ میں وہ خود میرزا مظہر کی خدمت میں حاضر ہوئے[1] اور چار سال ان کی خدمت میں رہ کر مقاماتِ عالیہ پر پہونچے[2]، اس مدت میں ان کے مکان سے جو خطوط جاتے تھے وہ انھیں کھول کر پڑھتے نہیں تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وطن اور اہلِ وطن کی محبت ان کے کارِ خیر میں فتور پیدا کرسکے[3]، خرقۂ اجازت و خلافت حاصل کرکے وہ اپنے وطن لوٹے اور رشد و ہدایت میں مشغول ہوئے[4]، انھوں نے لکھنؤ کے ایک محلہ بنگالی ٹولہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی اور کچھ دنوں وہاں بھی وہ قیام کیا کرتے تھے[5]، میرزا صاحب ان پر بہت مہربان تھے، خود مولوی نعیم اللہ کا بیان ہے کہ ایک بار میرزا صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تمھارے سلوک کے چار سال دوسروں کے بارہ سال کے برابر ہیں[6]،

انھوں نے ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں بہرائچ میں وفات پائی اور وہیں وہ مدفون ہوئے[7]،

مولوی نعیم اللہ نے میرزا مظہرؒ کے حالات میں دو کتابیں لکھی ہیں: بشاراتِ مظہریہ، اور معمولاتِ مظہریہ، ان میں ان کے خاندانی و ذاتی حالات اور مشغولیتوں کے علاوہ ان کے معمولات کا تفصیل سے ذکر ہے، بشاراتِ مظہریہ قلمی ہے اور ۲۱۰ اوراق پر مشتمل ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے، معمولاتِ مظہریہ چھپ چکی ہے، انھوں نے میرزا صاحب کے مکتوبات کا ایک انتخاب بھی رقعاتِ کرامت سعادت کے نام سے تیار کیا تھا جو شائع ہوچکا ہے،

---

[1] مولوی نعیم اللہ، بشاراتِ مظہریہ، ق اب و ق ۲ [2] شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، فصل ہفدہم، ص ۸۲ [3] مولوی نعیم اللہ، معمولاتِ مظہریہ، دیباچہ از مولوی ابوالحسن، ص ۲ [4] شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، فصل ہفدہم، ص ۸۲

[5] مولوی نعیم اللہ، معمولاتِ مظہریہ، دیباچہ از مولوی ابوالحسن، ص ۳ [6] شاہ غلام علی، مقاماتِ مظہری، فصل ہفدہم، ص ۸۲

[7] مولوی نعیم اللہ، معمولاتِ مظہریہ، دیباچہ از مولوی ابوالحسن، ص ۲

مولوی غلام یحییٰ:

حفظ قرآن کے بعد علم ظاہری کی تحصیل میں مشغول ہوئے اور اس میں کمال کا درجہ حاصل کیا، شاہ غلام علی نے انھیں 'اجلۂ علمای تحریر و زبدۂ فضلای تقریر' کہا ہے[1]، حصول تعلیم کے بعد وہ طریقۂ قادریہ میں شاہ بدر عالم سادہ موی کے جن کا سلسلہ شاہ پیر محمد لکھنوی[2] سے ملتا ہے، مرید ہوئے اور بہت دنوں تک ان کی خدمت میں رہے، پھر حضرت میرزا مظہر[3] کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقۂ نقشبندیہ میں داخل ہوئے، ان سے خرقہ و اجازت مطلقہ حاصل ہونے کے بعد لکھنؤ واپس آ کر ترویج طریقہ میں مشغول ہوئے، وہ تقویٰ و طہارت اور اتباع کتاب و سنت میں راسخ قدم تھے[4]،

مولوی غلام یحییٰ کو علوم درسی میں کمال حاصل تھا، وہ تمام متداول کتابوں کا درس عمدگی سے دیتے تھے[5] لیکن جب ان کی مقبولیت بڑھی اور طالبان حق ان سے رجوع کرنے لگے تو علم ظاہر کی تدریس انھوں نے بند کر دی[6]، انھوں نے معقول کی کئی کتابوں پر حواشی لکھنے کے علاوہ متعدد رسالے تصنیف بھی کئے، ان میں رسالہ کلمات الحق جو مسئلہ توحید وجودی و توحید شہودی سے متعلق ہے، خصوصاً اہمیت رکھتا ہے[7]، یہ رسالہ انھوں نے میرزا مظہر کے ارشاد پر لکھا تھا، یہ درحقیقت حضرت شاہ ولی اللہ کے ایک رسالے کے جواب میں تھا، جس میں انھوں نے ابن عربی کی رائے سے اتفاق کیا ہے[8]، میرزا صاحب نے کلمات الحق کو پسند فرمایا اور اس پر چند سطریں لکھ کر اپنی خوشنودی کی مہر ثبت کی[9]،

---

[1] مقالات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۹، [2] مولوی نعیم اللہ، بشارات مظہریہ، ق ۱۹۲ او ب [3] ایضاً ب، [4] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۸۰ [5] مولوی نعیم اللہ، بشارات مظہریہ، ق ۱۹۲ ب، [6] شاہ غلام علی، کمالات مظہری، [7] ایضاً مقامات مظہری، فصل ہفدہم، ص ۸۰،

انھوں نے ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں لکھنؤ میں وفات پائی، وہ تکیۂ شاہ پیر محمد لکھنوی میں آسودۂ خواب ہیں [۱]،

تلامذہ:

میرزا مظہر ایک بلند مرتبہ صوفی اور نغز گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دقیقہ رس، سخن سنج و نکتہ شناس استاد بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ بزم مظہر میں اگر ایک طرف روحانی تربیت کا سامان تھا تو دوسری طرف ذوق سخن کی تربیت ہوتی رہتی تھی، اس بزم سے اگر قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولوی ثناء اللہ سنبھلی، شاہ غلام علی، مولوی غلام یحییٰ بہاری وغیرہ نے روحانی تربیت پا کر حقائق و عرفان کی روشنی پھیلائی تو انعام اللہ خاں یقین، خواجہ احسن اللہ بیان، محمد فقیہ صاحب دردمند، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ جیسے نغز گو شاعر بھی اٹھے جو اردو کے ایوان سخن کی زینت کا باعث ہوئے،

بھگوان داس ہندی میرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کا بیان ہے کہ "شاگردانِ او بسیار بودند" [۲] لیکن عام طور پر ان کے ان "شاگردان بسیار" کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے، نیچے چند شاگردوں کے نام دیئے جاتے ہیں،

۱ انعام اللہ خاں یقین	۶ محمد فقیہ صاحب دردمند
۲ خواجہ احسن اللہ بیان	۷ غلام احمد منشی
۳ محمد باقر حزیں	۸ شاہ قلندر
۴ ہیبت قلی خاں حسرت	۹ میر ناصر سامان
۵ شاہ قدرت اللہ قدرت	۱۰ سنگم لال عزت

---

[۱] مولوی نعیم اللہ، بشارات مظہریہ، ق ۱۹۲ ب [۲] سفینۂ ہندی، ص ۸۸،

۱۱ محمد خان ظاہر ۱۴ بساون رائے بیداد

۱۲ کشن چند مجروح ۱۵ منعم

۱۳ حمید بیگ اظہر ۱۶ ملال

ان شعرا میں بعض صاحب دیوان ہیں اور استادی کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جن کے صرف نام اور چند اشعار تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں، ذیل میں ان چند کے مختصر حالات دیئے جاتے ہیں جو صاحب دیوان ہیں،

یقین :

انعام اللہ خاں نام تھا اور یقین تخلص، نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے اور حمید الدین خاں نیمچہ کے پوتے تھے، اورنگ زیب حمید الدین خاں کی بڑی عزت کرتا تھا، اور اظہر الدین خاں کو محمد شاہ کا قرب حاصل تھا اور خود یقین وزیر الممالک عماد الملک کے دور نظامت میں جاہ و تمکنت کی زندگی بسر کرتے تھے[۱]، ان کا سلسلۂ نسب حضرت مجدد الف ثانی سے ملتا ہے[۲]، یقین دہلی کے رہنے والے تھے، نہایت خوش رو، خوش گو اور خوش ظن تھے، تذکرہ نگاروں میں صرف میر تقی میر نے ان کی بد مزاجی کی شکایت کی ہے[۳]، بدقسمتی سے انھیں افیون کھانے کی لت پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا[۴]، ۱۱۶۹ھ (۵۵-۱۷۵۶ء) میں جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گئے[۵]، انھیں اپنے استاد میرزا مظہر سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کے دیوان میں متعدد ایسے اشعار استاد کی تعریف میں موجود ہیں جن سے ان کے انتہائی خلوص و ارادت کا پتہ چلتا ہے، مثلاً۔

---

[۱] قدرت اللہ قاسم، مجموعہ نغز، حصہ دوم، ص ۵۵ [۲] ایضاً [۳] فتح علی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۴۶ [۳] نکات الشعرا، ص ۱۰ [۴] لچھمی نرائن شفیق، چمنستان شعرا، ص ۱۶۳ [۵] ایضاً، ص ۱۶۴،

جوں نماز اپنے یہ صبح و شام لازم کر یقیں | حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

میرزا صاحب کو بھی یقین سے بڑی محبت تھی، مصحفی کا بیان ہے کہ "میرزا جان جاناں اورا بسیار دوست داشتی و اکثر بخانۂ اش شب را روز و روز را شب کردی"[1]۔

یقین کا کلام ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا، میر تقی میر نے انھیں (۱۱۶۵ھ) میں صاحب دیوان لکھا ہے، ان کے کلام کی شہرت خود ان کی زندگی میں ہو چکی تھی اور تمام قدیم تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کو سراہا ہے، البتہ میر تقی میر چونکہ ان سے کسی وجہ سے بہت خفا تھے، اس لئے انھوں نے تعریف کے بدلے تنقیص کی ہے حالانکہ ابتدا میں یہ لکھ آئے ہیں کہ "از بسکہ اشتہار دارد محتاج بہ تعریف و توصیف نیست"[2]، ان کے کلام میں لطف بیان کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے، زبان شستہ و رفتہ ہے، متروکات کا استعمال ان کے یہاں بہت کم ملتا ہے، یہ میرزا صاحب کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے، ان کا دیوان میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو ہند، کی طرف سے شائع ہوا۔

چند اشعار بطور نمونہ نیچے نقل کئے جاتے ہیں:

ہے ترے داغ سے تر سینۂ سوزاں میرا | آب و رنگ آگ سے رکھتا ہے گلستاں میرا

سچ کہو اے بلبلو، کس باغ سے آتی ہو تم | ہے ہمارے بھی تمھیں کچھ آشیانے کی خبر

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو | یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب | رات دن جلتا ہے یکساں داغ حسرت کا چراغ

بے نگاہ گرم رہتا ہے مرا باطن سیاہ | حسن کا شعلہ ہے میرے دل کی خلوت کا چراغ

سالہا سوز محبت کو چھپایا تھا یقیں، | ہاتھ آخر ہو گیا میرے گریباں کا حریف

---

[1] تذکرہ ہندی، ص ۵، [2] نکات الشعرا،

ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے ۔۔۔ بیگانگی سے اس کے کوئی آشنا نہیں

یقیںؔ مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع ۔۔۔ شہادت اس کو کہتے ہیں، سعادت اس کو کہتے ہیں

روداد محبت کی مت پوچھ یقیںؔ مجھ سے ۔۔۔ کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

بیان:

خواجہ احسن اللہ بیان کا آبائی وطن کشمیر تھا[1] لیکن ان کی پیدائش آگرے میں ہوئی[2]، اور آگے چل کر خود انھوں نے دلی میں سکونت اختیار کی، وہ مولانا فخرالدین دہلوی کے مرید تھے اور میرزا مظہر سے مشورۂ سخن کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت لڑکپن میں نہیں ہوئی تھی، کیونکہ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ "در آخرہا قدری تحصیل علم صرف ونحو ہم نمود وبہ خاکپای طلبای جہان اعنی قاسم ہیچمدان سراپا نقصان تکرار سبق خود بیشتر۔۔۔ می کرد"[3]، آخر عمر میں وہ حیدرآباد چلے گئے اور نظام علی خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے[4]، فن مصاحبت میں مشاق تھے[5]، شفیق نے لکھا ہے کہ "وجاہت صوری اور حسن سیرت میں بہرۂ وافی رکھتے تھے"[6]، انھوں نے ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) حیدرآباد میں وفات پائی، ان کے ایک شاگرد گلاب چند ہمدم نے تاریخ کہی تھی،

استاد از جہاں رفت،

بیان کا دیوان ابھی تک چھپ نہیں سکا، اس کے متعدد قلمی نسخے پائے جاتے ہیں[7]، یہ دیوان غزلیات، مخمسات، رباعیات، قصائد، مراثی، مثنویات اور ایک واسوخت اور ایک مسدس پر مشتمل ہے، نیچے چند اشعار غزلوں کے نقل کئے جاتے ہیں،

---

[1] قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، حصہ اول، ص ۱۲۳ [2] لچھمی نراین شفیق، چمنستان شعرا، ص ۵۲ [3] مجموعۂ نغز، حصہ اول، ص ۱۲۴ [4] مصحفی، تذکرۂ ہندی، ص ۳۶ [5] لچھمی نراین شفیق، چمنستان شعرا، ص ۵۲ [6] ایضاً۔

کیوں آج سماتا نہیں سینے میں خوشی سے / کیا تجھ کو بیاں پہنچا ہے پیغام کسی کا؟

مصلحت ترک عشق ہے ناصح / لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

بیاں کون ہے؟ اب تلک پوچھتے ہو / تغافل کے قرباں! تجاہل کے صدقے

آیا ہوں اس گلی سے ابھی دم نہیں لیا / پھر لے چلا ہے یہ دلِ وحشی ادھر مجھے

نگاہوں کی زبانکو اہل محفل کوئی کیا جانے / مری اور اسکی کیا کیا ہو گئیں باتیں خدا جانے

فرشتوں کی عبادت کا مصلّیٰ ہے مرا دامن / اگر آلودگی دنیا کی اسکو پاک رہنے دے

جاتا ہے یار کچھ تو بیاں منہ سے بول لے / اے بے نصیب مانعِ گفتار کون ہے

حزیں:

میر محمد باقر حزیں خلف فخر اللہ خاں عظیم آباد کے رہنے والے تھے، والد کی شہادت کے بعد دلی چلے گئے. نادر شاہی ہنگامہ فرو ہونے کے بعد عظیم آباد واپس چلے آئے[1]، جب وہاں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو بنگالا چلے گئے[2]، ان کا انتقال مرشد آباد میں ہوا[3]، ان کی وفات کے سلسلے میں گردیزی لکھتے ہیں کہ "دریں ولا از میرزا مظہر مسموع شد کہ لشکر عشق رعنا جوانی بر شہرستان دلش تاراج آوردہ صبر و شکیب را پایاں بردہ درہمیں ستیز و آویزہ ودیعت حیات را بمقتضای اجل سپرد[4]"۔

حزیں میرزا صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اور اس کا اظہار انھوں نے اشعار میں بھی کیا ہے، مثلاً

---

[1] کلیم الدین احمد، مرتبہ، دو تذکرے، تذکرۂ شورش، ص ۱۲۱ [2] میر تقی میر، نکات الشعرا، ص ۱۰۶، قائم چاندپوری، مخزن نکات، ص ۵۱، [3] کلیم الدین احمد، مرتبہ دو تذکرے، تذکرۂ عشقی، ص ۲۴۲
[4] فتح علی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان، ص ۳۶

اے حزیں شکر کہ ہے مصحف ارباب جنوں　　فیض سے حضرت استاد کے دیوان میرا

شورش نے لکھا ہے کہ حزیں نے دہلی کے قیام کے زمانے میں دو دیوان مرتب کئے تھے،[1] ممکن ہے ان کے بعد بھی کوئی دیوان مرتب ہوا ہو، بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ایک ساقی نامہ بھی کہا تھا، لیکن سب ناپید ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

خوب بوجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا　　معتقد جی سے ہوں اس دل کی میں دانائی کا

وہ نگاہ مست ہے اس چشم گریاں کا علاج　　مے سے ہوتا ہے خمار مے پرستاں کا علاج

حال اے قاصد جو کچھ جاتا ہے دیکھ　　اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

آتی ہے نوبہار دھڑکتا ہے مرا　　پھر شور و شر کرے گا یہ خانہ خراب دل

ناصح نہ اس طرح کی باتیں مجھے سنا دے　　دیکھے مرے سجن کو آکر مرے نین میں

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار　　اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں پہ کیا کروں　　رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشم تر مجھے

حسرت:

ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آباد کے رہنے والے تھے، کچھ دنوں نواب شوکت جنگ کی خدمت میں رہے، پھر نواب سراج الدولہ کے دربار سے توسل پیدا کیا، جب سراج الدولہ کا دور حیات و حکومت ختم ہو گیا، اور مختلف انقلابات کے بعد میر مبارک علی خاں بہادر ناظم بنگالہ ہوئے تو یہ ان کی رفاقت میں رہنے لگے، ان کا انتقال ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں ہوا[2] حسرت بڑے لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، علم مجلسی کے ماہر تھے[3]، ان کا دیوان تقریباً

---

[1] ص ۱۲۱ ج ۲ [2] میرزا لطف علی، گلشن ہند، ص ۱۱۱ [3] ایضاً

دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے[1]۔ یہاں چند اشعار نمونے کے طور پر دیے جاتے ہیں:

چھپاؤں اشکِ گلگوں کس طرح ہائے
گریباں ہو رہا ہے جا بجا سرخ

آپ ہی اپنے یار تھے جانا نہیں
غیر ہیں بھولے تھے پہچانا نہیں

ہم نہ ہوں تو ہو تو سب چرچا کریں
شمع ہے محفل میں پروانہ نہیں

اڑا دے اے دوا شورشِ سودا سب ڈر کو
بہار آئی تو کیدھر دیکھتا پھونک دے گھر کو

لے اڑا اپنا کام پروانہ
ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے

ناصح عبث شامت ہیں مبتلا کسو کے
کچھ دل بھی گیا بھرے ہیں بھر گئے گیا کسو کے

دردمند:

محمد فقیہ صاحب دردمند بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے، لیکن ان کا اردو ساقی نامہ بہت مشہور ہے۔ وہ اودگیر (علاقۂ بیدر) کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳ء) میں صغر سنی میں اپنے والد کے ساتھ شاہ جہاں آباد گئے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ کچھ دنوں بعد والد کا انتقال ہو گیا تو حضرت میرزا مظہر نے انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور ان کی تربیت سے وہ مجموعۂ کمالات ہوئے[2]۔ صاحب بشارات مظہریہ نے انھیں "صاحبزدہ کثیر المناقب"[3] کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ خود میرزا صاحب نے ان کے فضل و کمال کی سند اس طرح دی ہے،

مظہر مباش غافل از احوالِ دردمند
لعلیست اینکہ در گرہ روزگار نیست

دردمند نے بھی میرزا صاحب کے لطف و شفقت کا جواب خلوص و ارادت سے دیا۔ خوشگو کا بیان ہے کہ "باقتضای فرط عقیدت و علو فطرت در اوضاع و اطوار تقلید را

---

[1] میرزا علی لطف، گلشن ہند، ص ۱۱۱ [2] آزاد بلگرامی سرو آزاد، ص ۲۲۳ [3] ق ۲۲ ا ۔

بہ تحقیق رسانده که در اسلوب خطوط و طور شعر هم درمیان استاد و شاگرد فرقی نمی ماند[1]،

خود دردمند نے اپنے جذبات عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے،

زہے پیر و مرشد زہے پیشوا | کوئی کیا کرے اس کی مدح و ثنا
خدیو سخن میرزا جانِ جاں | کہ حکم اس کا ہے ناطقہ پر رواں
لقب اس کا ہے ذو الجلال سخن | کہ بندے ہیں سب اس کے اربابِ فن
سب اربابِ فن اس سے ہیں مستفید | کہ علم و ادب اس کے دونوں مرید
کوئی آج اس کے برابر نہیں | وہ سب کچھ ہے الا پیمبر نہیں

دردمند شاہ جہاں آباد سے عظیم آباد گئے، چند روز وہاں رہ کر دلی واپس آئے، اور پھر مرشد آباد چلے گئے، آخر وہیں ۱۱۷۶ھ میں انتقال کیا[2]،

دردمند کا فارسی دیوان ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا، لیکن اردو کلام بہت کم پایا جاتا ہے، ان کا ساقی نامہ بہت مشہور ہے، اس کے چند منتخب اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ان سے دردمند کی قادر الکلامی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

ارے ساقی اے جانِ فصلِ بہار | یہی تھا ہمارا و تیرا قرار؟
ہمارے بسرنے کی یہ فصل تھی؟ | فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟
نظر تو کر ٹک چمن کی طرف | شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک | کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
تجھے جام گل کے لہو کی قسم | تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کے چشم تر کی قسم | تجھے اپنے پنہاں نظر کی قسم

---

[1] بندرا ابن خوشگو: سفینۂ خوشگو قلمی، [2] میرزا علی لطف، گلشن ہند، ص ۱۳۰،

ادا سے لٹکنے کی تجھ کو قسم
نشہ سے بہکنے کی تجھ کو قسم

تجھے جام صہبا کے سر کی قسم
تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم

قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی
قسم ہے مرے نام کے ننگ کی

ارے بے وفا بے مروت صنم
میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم

جو تونے کیا ہے کو تجھ پر حرام
تو اتنا کر اے ظالموں کے امام

کہ تو سر کشی سے نہ کر پائمال
مرے خون کو اپنے اوپر حلال

نہ یہ مے نہ یہ باغ رہ جائے گا
نہ ملنے کا یہ داغ رہ جائے گا

اخلاق و عادات:

میرزا صاحب کا قد کشیدہ و بلند تھا، وہ عمامہ بطور سنت باندھتے اور قمیص پیش چاک استعمال کرتے تھے[1]، انشاء اللہ خاں انشاؔ ان کی ملاقات کو گئے ہیں تو وہ سفید قمیص اور سفید کلاہ پہنے ہوئے تھے اور کاندھوں پر ناپاتی رنگ کا دوپٹا سموسہ بنا کر ڈال رکھا تھا[2]، کریم الدین لکھتے ہیں کہ "داڑھی خشخاشی رکھتے تھے[3]" لیکن میرزا صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو جیسا کہ آگے چل کر ذکر ہوگا سنت نبوی کا اتباع ہے، اسلئے کریم الدین کا بیان مشتبہ ہے، مزاج میں نفاست و لطافت کو بہت دخل تھا اور درویش ہونے کے باوجود ان کی مرزائیت اپنی جگہ پر قائم تھی[4]، چنانچہ خود انھوں نے اپنی اس افتاد طبع کی طرف کلام میں کہیں کہیں اشارہ کیا ہے، مثلاً

در جنوں ہم میرزائی از مزاج ما نرفت
کز برای خویش جامی زگلخن داشتیم

بجای سنگ طفلاں پارہ ہای شیشہ باید زد
چو مظہر میرزا دیوانۂ نازک طبیعت را

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۳ [2] دریائے لطافت، اردو ترجمہ از پنڈت کیفی، ص ۲۹۱
[3] کریم الدین، طبقات شعرائے اردو، ص ۱۰۰ [4] ایضاً، ص ۱۲۶

در جای سنگ شیشہ تواں بر سرش زدن | طفلاں دماغ مظہر دیوانہ نازک ست
مظہر زما برید و دگر یاد ما نہ کرد | دیوانہ خوش نبود ز وضع کرخت ما

حسن دوستی و لطافت پسندی میرزا صاحب میں بہت تھی اور بچپن ہی سے تھی، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ عشق و محبت کی چنگاری میری طینت میں داخل ہے اور آغاز شباب ہی سے میرا میلان خاطر مظاہر جمیلہ کی طرف رہا ہے[۱]۔

مولوی نعیم اللہ کا بیان ہے کہ خوبصورت عورت کی گود میں ہمک کر چلے جاتے اور پھر بڑے حیلے حوالے سے اس کی گود سے اترتے[۲]۔

مولوی نعیم اللہ نے بشارات مظہریہ میں لکھا ہے کہ خود میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی سے ذرا سی بھی خلاف قاعدہ کوئی حرکت ہو جاتی ہے تو میری طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اور میں اسے چھپا نہیں سکتا[۳]، لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرزا صاحب کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے مزاج میرزائی اور مزاج درویشی کو آب گرم اور آب سرد کی طرح سے ملا کر ہمیشہ اعتدال پر رکھا ہے، چنانچہ عالم جوانی میں اگر میری ایک رات کسی عزیز کے مکان پر پرتکلف مسند پر اور نرم لحاف میں بسر ہوتی تو دوسری رات کسی مسجد یا ویرانے میں ٹاٹ کے بستر پر گذرتی[۴]۔

میر اشرف علی خاں نے جو میرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کی حسن دوستی اور بدیہہ گوئی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جسے یہاں نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ عنفوان شباب کے زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک دن برسات کے موسم میں جب کہ

---

[۱] شاہ غلام علی، مقامات مظہریہ، ص ۱۶ [۲] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، [۳] ق ۹ ب۔ [۴] ق ۱۱ ا۔

کوہ وصحرا سرسبز وشاداب تھے میرزا صاحب حضرت قطب الاقطاب کی زیارت کو تشریف لے گئے، اس کے بعد اطراف میں سیر و تفریح کے لئے نکل گئے، ایک خانقاہ میں بیٹھے تھے کہ اتفاقاً ایک محبوبہ حور لقا جو شاعرہ ہونے کے علاوہ ظریفہ لطیفہ گو اور حاضر جواب بھی تھی، حالت خمار میں وہاں پہونچی اور میرزا صاحب کو دیکھ کر کہا کہ آپ کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا آپ عاشق ہیں یا دیوانے یا شاعر، میرزا صاحب نے جواب دیا کہ میں عاشق و دیوانہ ہوں اور کبھی کبھی "بتقریب ازول" میری زبان پر اشعار آجاتے ہیں، اس ظریفہ نے کہا کہ کوئی شعر سنایئے، میرزا صاحب نے کہا کہ پہلے تم کوئی شعر سناؤ تاکہ مجھے تمہارا ذوق شعری معلوم ہو جائے اور اسی مناسبت سے میں تمھیں کوئی شعر سناؤں، اس بت طناز نے "حسب حال ومناسب وقت" یہ شعر پڑھا:

ای ہوای سبزۂ کوہ ... موسم گذار ابر اگر باراست بر دوش تو بر دوشم گذار

میرزا صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

شور باراں بر نمی تابد تن مخمور من پنبہ بردار از سرمینا و در گوشم گذار[1]

میرزا صاحب کی حسن دوستی، نفاست پسندی اور لطافت طبع اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ لوگوں نے ان سے متعلق حکایتیں گھڑ لی ہیں، مثلاً بندرابن خوشگو ان سے انتہائی ارادت وخلوص رکھنے کے باوجود یہ لکھتے ہوئے نہ جھجکے کہ،

"باوجود رعایت عالم سلوک واحتیاط ہای کامل خود را بہ عشق نوجواناں درباختہ و سراپا بزنگ درد برآمدہ، چندی درمیان او و منظور نظرش شکرآب بود۔

---

[1] تذکرۃ الشعرا، قلمی،

شش ماہ از مسجدی کہ اقامت داشت بر نیامد و قبری برای خود کندہ زندہ خود را مدفون ساخت[1]

کسی تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میرزا صاحب کی اقامت گاہ کوئی مسجد تھی، ان کے مکاتیب ان کی انتہائی معروف زندگی کی شہادت دیتے ہیں، اوپر لکھا جا چکا ہے کہ "ہنگام جوانی" ختم ہونے کے بعد انھیں شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہ گئی تھی، جب ذوق سخن باقی نہ رہ جائے تو "عشق نوجواناں" کا تصور کرنا ہی غلط ہے اور وہ بھی عالم سلوک کی رعایت اور احتیاط ہای کامل کے باوجود، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خوشگو نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض ان کی خوش گوئی ہے،

اسی طرح کریم الدین اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ اگر رستہ میں کسی کی چارپائی ٹیڑھی رکھی ہوتی یا جھلنگا پڑی پاتے تو اسی جگہ بیٹھ جاتے اور جب تک درست نہ ہو لیتی وہاں سے ہرگز نہ ٹلتے[2]، شاید کریم الدین نے مندرجہ ذیل واقعہ کی بنا پر یہ بے بنیاد عمارت کھڑی کر دی ہو،

"حضرت میرزا صاحب طبعاً نہایت نازک اور لطیف الطبع تھے، چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ جس دن حضرت میرزا صاحب خانقاہ (خانقاہ شاہ عبد الہادی امروہی) میں تشریف لائے شاہ صاحب (شاہ عبد الہادی) نے ایک چارپائی تیار کرائی تھی جس پر پہلی مرتبہ حضرت میرزا صاحب نے استراحت فرمائی، صبح کو شب بھر نیند نہ آنے کی شکایت کی اور فرمایا کہ اس میں کان ہے، ناپنے سے معلوم ہوا کہ واقعی خفیف سی کان موجود تھی[3]

---

[1] سفینۂ خوشگو، ص ۳۰۲ [2] طبقات شعرائے اردو، ص ۱۰۶ [3] محمود احمد عباسی، تذکرۃ الکرام، بھیجانی ص ۱۶۵،

گارساں دتاسی نے میرزا صاحب کی حسن دوستی و لطافت مزاج پر بڑا بلیغ تبصرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ زاہدانہ زندگی کے ساتھ ساتھ زندگی کے جمالیاتی پہلو کو بھی نباہنا انھیں خوب آتا تھا۔[1]

لیکن مولانا محمد حسین آزاد نے میرزائیت اور نازک مزاجی میں کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ انھوں نے میرزا صاحب کی نفاست پسندی اور میرزائیت کو نازک مزاجی و بد دماغی سے تعبیر کیا اور ان کے اطوار و عادات کے بیان میں طنز و استہزا سے کام لیا، صاحب گل رعنا نے ان کے اس الزام کی عمدگی سے تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں،

"شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے (میرزا صاحب) کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانے کے لوگ اچھا نہ سمجھیں ۔۔۔۔ کچھ تو اس اعتقاد سے ؎

خطای بزرگاں گرفتن خطاست،

اور کچھ ۔۔۔ میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں، الخ ص ۱۳۸

"تاباں کا حال جیسا چمکا کر لکھا ہے اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح سے بیان کیا ہے وہ بھی ملاحظہ طلب ہے، (ص ۱۳۹) شعر مندرجہ صفحہ ۱۰۴[2] کو پڑھئے، پھر

---

[1] گارساں وتاسی: تاریخ ادبیات ہندوی ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی) جلد دوم، ص ۹۰ [2] آب حیات کے مختلف اڈیشن (بشمول طبع ثانی) مولف کے سامنے ہیں، کسی میں صفحہ ۱۰۴ پر میرزا صاحب کا کوئی شعر نہیں، معلوم نہیں مولانا آزاد کا اشارہ کس شعر کی طرف ہے۔

میرزا صاحب جیسے مہذب کو اور آزاد کی معذرت کو دیکھئے، فرماتے ہیں کہ تہذیب آنکھ دکھاتی ہے، مگر کیا کیجئے ایشیائی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے، (ص ۱۴۰) میرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ گھر میں ایک دھوبن ڈال لی تھی۔" (ص ۱۴۳)

کسی واقعہ کی صورت بنانے کا نمونہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ "ایک نواب صاحب کہ ان کے خاندان کے مرید تھے، ملاقات کو آئے اور خود صراحی لے کر پانی پیا، اتفاقاً جو آبخورہ رکھا تو ٹیڑھا رکھا، میرزا صاحب کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا اور بگڑ کر کہا کہ عجیب بے وقوف و احمق تھا جس نے تمہیں نواب بنا دیا، آبخورہ بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا، میں پوچھتا ہوں کہ اس میں لطیفہ کیا ہوا! یہ جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، میرزا صاحب کی نازک مزاجی نہیں آتش مزاجی، ضبط و تحمل کی کمی اور بد تہذیبی کی بین مثال ہو سکتا ہے، نواب کے قصور پر بادشاہ کو بے وقوف اور احمق میرزا صاحب کی زبان سے کہلانا کتنی دور از قیاس بات ہے،

"واقعہ یہ ہے کہ ایک نواب زادے ملنے کو آئے جن کا تمام خاندان میرزا صاحب سے عقیدت رکھتا تھا اور خود یہ صاحبزادے میرزا صاحب کے شاگرد تھے، ان کو پیاس معلوم ہوئی، ادھر ادھر دیکھنے لگے، کوئی آدمی نظر نہیں آیا، میرزا صاحب سمجھ گئے، فرمایا کہ پیاس ہو تو خود اٹھ کر پی لو، گھڑا اور آبخورہ قرینہ سے ایک طرف کو رکھا ہوا تھا، انھوں نے اٹھ کر پانی پیا اور آبخورہ جو رکھا ٹیڑھا رکھا، گھڑے کو بھی سیدھا نہیں کیا اور بیٹھ گئے، اور جوش عقیدت میں آکر عرض کیا

کہ بغیر کسی پیش خدمت کے آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی، اگر ارشاد ہو تو دو ایک خدمتگار متعین کر دوں، میرزا صاحب نے ہنس کر گھڑے کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ تم کو آبخورہ رکھنے کا سلیقہ نہیں تو تمہارے خدمتگار کو کیا ہوگا۔[۱]

مذکورہ بالا واقعہ نواب عماد الملک کے ساتھ پیش آیا تھا جو اس وقت عالم گیر ثانی کا وزیر تھا، پورا واقعہ مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے اس طرح سے بیان کیا ہے،

"نواب عماد الملک اپنی وزارت کے زمانے میں ایک دن میرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے حاضرین مجلس میں سے ایک شخص سے پانی مانگا، میرزا صاحب نے اس سے کہا کہ صاحب خانہ اور آپ کا میزبان میں ہوں، آپ کو جو کچھ چاہئے مجھ سے کہئے، یہ عزیز میرے پاس استفادے کی غرض سے آتے ہیں اور مجھے ممنون کرتے ہیں، کیونکہ یہ زندہ جواہر پارے اور لعل دوختہ ہیں، یعنی ان میں سے بیشتر بزرگ اور بزرگ زادے ہیں یا عالم وحافظ قرآن، یہ لوگ اس لایق ہیں کہ خود ان کی خدمت و تعظیم کی جائے، آپ ان سے اس طرح بے ادبی سے پیش آتے ہیں، ناچار نواب نے اٹھ کر اپنے ہاتھ سے پانی پیا اور آکر عرض کیا کہ اگر حضرت فرمائیں تو دو ہشیار خدمتگار خانقاہ کے صوفیہ کی خدمت کے لئے مقرر کر دیئے جائیں، میرزا صاحب نے کہا، سبحان اللہ! آپ ہندوستان کے وزیر ہیں، اور اس کے باوجود آپ نے آبخورہ صراحی پر ٹیڑھا رکھا کہ اسے دیکھ کر ہمارا دماغ پریشان ہو رہا ہے، پھر آپ کے خدمتگاروں سے ہم فقیروں کی کیا خدمت ہو سکے گی۔"[۲]

---

[۱] مولانا عبد الحئی، گل رعنا، ص ۲۷۰-۲۴۴ [۲] بشارات مظہریہ، ق ۱ ب،

حقیقت یہ ہے کہ میرزا صاحب میں سنجیدگی ومتانت بہت تھی اور نفاست وپاکیزگی کے ساتھ ساتھ اسلامی طریق معاشرت اور آداب مجلس کا بہت خیال رکھتے تھے، ایک ہم عصر کا بیان ہے کہ "چہ در سلیقہ نشست وبرخاست وچہ در غیرت ہندوستانی زائی ضرب المثل عالی قدرداں بود"[۱]

خود مولانا آزاد کو بھی یہ تسلیم ہے کہ "جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا"[۲] اس ضمن میں مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جسے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

ایک دن عماد الملک عالمگیر ثانی (م ۱۷۵۹ء) کو میرزا صاحب کی خدمت میں لیکر آیا، بعد میں شہزادے آئے، انھوں نے میرزا صاحب کو مجری عرض کیا، میرزا صاحب نے فرمایا، ان لوگوں کا کوئی اتالیق ہے یا نہیں؟ مجرا صرف بادشاہ کو عرض کیا جاتا ہے، فقیروں اور عالموں کے لئے سلام علیک بس ہے"[۳]

تمام ہم عصر تذکرہ نگار میرزا صاحب کے حسن اخلاق کے معترف ومداح ہیں مثلاً، سراج الدین علی خاں آرزو کہتے ہیں کہ "از ابتدای نو مشقی با فقیر کمال اخلاص و ارتباط بود"[۴]

احمد علی سندیلوی لذت صحبت گذشتہ کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ "فقیر راقم مسودہ در سہ دفعہ بخدمتش رسیدہ تا ہنوز لذت صحبتش از دل رفتہ"[۵]

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ "فقیر را با میرزا ملاقات صوری نہ بستہ اما غائبانہ اخلاص کامل

---

۱ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، قلمی، ۲ آب حیات، ص ۱۴۰ ۳ بشارات مظہریہ ق ۱ب ۴ مجمع النفائس، قلمی، ۵ مخزن الغرائب، قلمی،

است وہمیشہ بہ آمد ورفت مراسلات حظ ہمکلامی حاصل [۱]"

میر تقی میران کی خوش بیانی کی اس طرح مدح کرتے ہیں: "بندہ بخدمت او سعادت اندوز گشتہ است، خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد [۲]"

گردیزی کا بیان ہے کہ "بمکارم اخلاق شریف معروف (است [۳])"

قدرت اللہ شوق اس طرح اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں: "میرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت... میرزا عجب کسی است کہ در شاہ جہاں آباد دہلی... چواد شخصی خوش قماش، نازک طبع برنخاستہ تا بدیگری چہ رسد [۴]"

خوش گو ان کی خدمت میں یوں ہدیہ خلوص وارادت پیش کرتے ہیں: "و آداب معاشرت وحسن سلوک..... وقدردانی یکتای روزگار بیاری از اخوان الصفا دیدہ شد بخوبی این بزرگوار کم بہ نظر آمدہ..... بر فقیر خوش گو خیلی مہربانی می فرماید، اکثر بویرانہ ام شب می گذرانند، و فرمایشہای اطعمہ از روی بے تکلفی می نماید [۵]"

قیام الدین حیرت اکبر آبادی کہتے ہیں کہ "گوہر کان نجابت است [۶]"

صاحب تذکرہ مسرت افزا ان کی خاکساری و بے نیازی اور حسن اخلاق کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں "با این ہمہ علم وکمال در لباس خاکساری و بی نیازی بسری برد..... اکثر مریدان وی را دیدہ بنہایت مہذب ومتشرع در کمال خلق وانکسار [۷]"

---

[۱] سرو آزاد، ص ۲۳۱ [۲] میر تقی میر، نکات الشعراء، ص ۵ [۳] فتح علی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۳۱ [۴] قدرت اللہ شوق، طبقات الشعراء (قلمی) [۵] بندرا بن خوشگو، سفینۂ خوشگو، (قلمی) [۶] قیام الدین حیرت اکبر آبادی، مقالات الشعراء (قلمی) [۷] ابو الحسن امیر احمد تذکرہ مسرت افزا بحوالہ رسالہ معاصر (پٹنہ) جلد ۲ حصہ ۷،

انشاء اللہ خاں انشا اگرچہ تذکرہ نگاروں کی فہرست میں نہیں آتے، لیکن اس موقع پر میرزا صاحب سے ان کی ملاقات کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ انشا بڑے اہتمام کے ساتھ میرزا صاحب سے شرف نیاز حاصل کرنے گئے تھے۔ اس ملاقات کا ذکر انھوں نے دریائے لطافت میں جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں میرزا صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو وہ "بڑی شفقت اور خوش اخلاقی سے جیسا کہ بزرگوں کا دستور ہے، سلام کا جواب دیتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور مجھ نالائق کے سر کو بغل میں لے کر اپنے پہلو میں بٹھالیا۔"[۱]

ان شواہد کی روشنی میں حاکم لاہوری کے مندرجہ ذیل بیان کو کسی غلط فہمی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ حاکم لاہوری کو دو مرتبہ میرزا صاحب سے مسجد جامع میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ پہلی ملاقات کا تاثر انھوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے، "سخنہای نہایت بعلو مراتب می فرمود و تعلی کمال در مزاجش معلوم شد۔"[۲]

دوسری ملاقات میں میرزا صاحب نے ان سے کہا کہ "روزی بغریب خانہ بیائی و شبی بگذرانی و اشعار مرا بشنوی۔"[۳]

دوسرا بیان تو میرزا صاحب کی انتہائی بے تکلفی اور خلوص کا پتہ دیتا ہے۔

سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرہ میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی میرزا صاحب کے بلند اخلاق اور عفو و کرم کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ،

"جب استیلائے فوج نادر شاہی مردم دہلی پر ہوا اور لشکر مخالف ہر گھر میں

---

[۱] انشاء اللہ خاں انشا، دریائے لطافت اردو ترجمہ از پنڈت کیفی، ص ۸۰ [۲] حاکم لاہوری: مردم دیدہ بحوالہ اورینٹل کالج میگزین (لاہور) [۳] ایضاً

غارت کو در آیا، میرزا کے امتعہ پر بھی دست ستم دراز کیا، اس وقت برای چاشت فقرا دیگ کھچڑی کے اجاغ پر رکھے ہوئے تھے، وہ میمون سرشت اسے ابالے کھانے لگے، میرزا صاحب نے باوجود جور و ستم کے ان سے کہا، روغن اور اچار طاق پر دھرا ہوا ہے، اس سے کھاؤ کہ مزا دے[1]"

عارف شیراز نے صحیح کہا ہے،

شنیدم کہ مردان راہ خدا　　　دل دشمناں ہم نکردند تنگ

حقیقت یہ ہے کہ میرزا صاحب بہت کریم الاخلاق تھے، ہر شخص کو محبت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ہر شخص سے کشادہ پیشانی اور خندہ روئی سے ملتے، بات نرمی سے کرتے، کسی پر اعتراض نہ کرتے، معذرت چاہنے والوں کو معاف کر دیتے، لوگوں کے مزخرفات کو بھی تحمل کے ساتھ سن لیتے، مرے ہوؤں کو نیکی سے یاد کرتے، کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے اور نہ غیبت کرنے والوں کو اچھی نگاہ سے دیکھتے، بہت سخی و فیاض تھے، مزارات متبرکہ کی زیارت اور بیماروں کی عیادت کو ضرور جاتے، جو ان کے عیوب ان پر ظاہر کرتا اس سے ناراض نہ ہوتے بلکہ اس کا شکریہ ادا کرتے[2]، اپنے ایک شعر میں بھی اس کا اظہار اس طرح کیا ہے:

عیب بیناں واقف از نقصان خویشم کردہ اند
ہمچو عینک ساخت چشم دیگراں بینا مرا

ملفوظات میں ہے کہ "صفت اقتصار و انکسار لازم باید گرفت و بر جفا و قفای خلق تحمل و صبر عادت باید ساخت[3]"

---

[1] سعادت خاں ناصر تذکرۂ خوش معرکہ زیبا قلمی [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۳۱
[3] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۲۰

میرزا مظہر کی بزم میں بڑی زندگی اور رنگا رنگی تھی، شاہ غلام علی نے اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

"میرزا مظہر کی مجلس اگر ایک طرف انوار خدا سے معمور تھی تو دوسری طرف اس میں فیض مصطفوی کا عکس نظر آتا تھا، ان کی محفل میں اگر ایک طرف نسبت نقشبندی کا استغراق دلوں میں محویت پیدا کرتا تھا تو دوسری طرف نسبت قادریہ کے "لمعان وصفائے حالات" کا ظہور ہوتا تھا اور "اذواق و اشواق چشتیہ" عشق کی بے تابی میں اضافہ کرتے تھے، اگر تعلیم احمدیہ کی لطافت و نیرنگی حاضرین مجلس میں "نضارت وصفا" پیدا کرتی تھی تو میرزا صاحب کا سکوت و مراقبہ نقوش ماسوا کو ان کے دلوں سے مٹاتا تھا، اسی طرح اگر ایک طرف شریعت و طریقت اور کیفیات نسبت باطنی کا ذکر گرمیٔ محفل کا سامان مہیا کرتا تھا تو دوسری طرف حدیث و تفسیر کی باتیں صفا و طمانیت قلب کا باعث ہوتی تھیں، شعر و سخن کی باتیں ذوق تازہ بخشتی تھیں اور افسردگی کو شگفتگی میں تبدیل کرتی تھیں کیونکہ جو کچھ میرزا صاحب کی زبان پر آتا تھا وہ دل سے نکلتا تھا، اور ذوق حال کا نتیجہ ہوتا تھا، حکایات صالحین دلوں کو کیفیات الٰہی سے سرشار کرتی تھیں، علمی مسائل ان کے بیان سے واضح ہوجاتے تھے، اور حقائق و معارف ان کی توضیح سے دلنشیں ہوتے تھے، ان کے یہاں ہر نکتہ کی شرح موجود تھی اور ان کا ناخن ہر عقدۂ مشکل کی گرہ کشائی کرتا تھا۔[1]"

---

[1] شاہ غلام علی: مقامات مظہری، ص ۳۱،

میرزا صاحب کو مشائخ کرام سے بڑی محبت تھی، بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی لئے اپنے مریدوں سے عصر کے بعد مکتوبات حضرت مجدد کے مطالعہ کی تاکید کیا کرتے تھے[1]

ملفوظات میں ایک جگہ ہے کہ میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "محبت ائمۂ اہل بیت اطہار و تعظیم اصحاب کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم" نہایت ضروری ہے[2]، اسی طرح ملفوظات میں اولیاء اللہ اور مشائخ کی تعظیم کی بھی تاکید ہے[3]، چنانچہ وہ صحابۂ کرام اور اولیای عظام کے نام تعظیم و تکریم کے بغیر کبھی زبان پر نہ لاتے[4]، وہ محبت مشائخ کو اس لئے ضروری سمجھتے تھے کہ دوستان خدا کی دوستی قرب خدا کا باعث ہے[5]، ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ ائمۂ اہل بیت اطہار کی محبت موجب ایمان و سرمایۂ تصدیق و ایقان ہے[6]، وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ میرے بزرگوں کی برکت ہے، ورنہ میرے اعمال ایسے کہاں جو مجھے قرب الٰہی نصیب ہو، مقربان و مقبولان خدا سے محبت رکھنا قبول خدا کا بہترین ذریعہ ہے[8]

لیکن وہ عرس و چراغاں کے قائل نہ تھے، چنانچہ اپنے مریدوں کو نصیحت کیا کرتے کہ "برسوم متعارفہ از عرس و چراغاں مقید مباش کہ ایں معنی مستلزم سوال خیمہ و فروش و عدم حفظ مراتب از ازدحام مردم می گردد[9]"

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۳۰، [2] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۸، [3] و [4] ایضاً ص ۸، [5] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۱۳۱ [6] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۸۸، [7] ایضاً ص ۸، [8] شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۳۶ - ۳۵ [9] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۸۹،

اسی بات کو انھوں نے ایک اور موقع پر زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا ہے،
وہ فرماتے ہیں کہ رسم و رواج جیسے عرس کے پابند نہ بنو کیونکہ اس میں بہت سی خرابیاں
ہیں، مثلاً،

(۱) رسم و رواج کی پابندی اہل طریقت کے مزاج کے خلاف ہے،

(۲) فرش و فروش اور سایبانوں کے لئے لوگوں کو تکلیف دینی پڑتی ہے،

(۳) روشنی و چراغاں کے سلسلے میں فضول خرچی ہوتی ہے،

(۴) وقت ضائع ہوتا ہے اور وقت کی محافظت ضروری ہے،

(۵) ہجوم کی وجہ سے حفظ مراتب کا اہتمام نہیں ہو پاتا لوگوں کو شکایت کا موقع ملتا ہے،

(۶) اس قسم کے رسم و رواج کی پابندی میں آدمی کبھی سودی قرض لینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور یہ شریعت میں حرام ہے،

(۷) نیاز غیر مشروع خدا کے یہاں قابل قبول نہیں کیونکہ،

ان اللہ طیب لایقبل الا الطیب[1]	اللہ پاک ہے اور صرف پاک چیز پسند کرتا ہے،

اپنے وصیت نامے میں لکھتے ہیں کہ "دکانی بر مزار من نچینند کہ در عین حیات ہم ازیں عادت برکنار بودم[2]"

میرزا صاحب کو جس طرح مشائخ سے عقیدت تھی اسی طرح اپنے مریدوں سے محبت تھی، وہ ان پر بہت شفقت فرماتے تھے، مثلاً قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے صاحبزادے

---

[1] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۷۰، [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۴۴،

مولوی دلیل اللہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "فقیر دلیل اللہ را بسیار دوست می دارد و عکس محبت او در مرأۃ قلب فقیر افتادہ وگرنہ در باطن ہرگز نقشی از نقوش صفحۂ کائنات نمی نشیند۱؎"

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے دوسرے صاحبزادہ مولوی احمد اللہ کی علالت کی خبر پاکر اس طرح اظہار تشویش و شیفتگی کرتے ہیں:

"از عم عارضۂ برخوردار احمد اللہ فقیر سخت تشویش دارد، عمر طبعی فقیر آخر شدہ وگرنہ از عمر خود بایں برخوردار بخشیدم کہ بہ محنت بسیار ایں نسخہ بہ صحت رسیدہ است۔ خدا او را عمر روزی کند۲؎"

ایک دوسرے مرید ظفر علی خاں کے متعلق اپنی محبت و شفقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں،

"آنچہ درباب برخوردار ظفر علی خاں نوشتہ اند واقعی ست، از اخلاق و مناقب و اخلاص و دیگر مراتب ہرچہ می باید بود و دل می خواہد او ہمہ دارد و ہمیں خوبیہای او مرا شکار دام محبت او کردہ . . . خدا او را فتوحات صوری و معنوی ارزانی دارد کہ مرا در دنیا عزیز تر از او کسی نیست۔ و در واقع بجای مادر و پدر و بجائے پرستار و نفر درحق او ہمیں فقیرم و از او ہم آداب ارادت و فرزندی و غلامی و بندگی بہ تقدیم می رسد۳؎"

ایک اور مرید فیض اللہ خاں کے محاسن و مناقب اس طرح بیان کرتے ہیں،

"از خوبیٔ فیض اللہ خاں صاحب چہ نگارم، مناقب و محاسن تمام عالم در نسخۂ ایں جوان

۱؎ کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ہفتاد و ہفتم ص ۸۴ ۲؎ ایضاً مکتوب ہفتاد و یکم ص ۸۳ ۳؎ ایضاً مکتوب سی ام ص ۴۲۔

جمع ساختہ اند، خدایش باقصیٰ مراتب دین و دنیا برساند[1]"

اسی طرح بعض مریدوں کے انتقال پر جس طرح انھوں نے اظہار غم کیا ہے، اس سے بھی ان کی محبت و شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً نواب ارشاد خاں کی وفات پر کسی کو لکھتے ہیں "نواب ارشاد خاں مغفور رحلت نمودند، آدمیت را بخاک بردند، خدا بیامرزد و تنہائی ما را تماشا باید کرد[2]"

میر سلمان میرزا صاحب کے خواجہ تاش بھی تھے اور مرید بھی، ان کی رحلت کی خبر پاکر لکھتے ہیں کہ "از خبر جاں گداز رحلت میر سلمان صاحب چہ نویسم کہ برمن گذشت،

یار رفت و ما چو نقش پا بخاک افتادہ ایم
سایہ می گردید کاش این نارسا افتادگی[3]

اپنے ارشد مریدین قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی والدہ کے انتقال پر اسی خط میں اس طرح اظہار غم کیا ہے، "خبر فوت مغفورہ مرحومہ مغلانی بیگم ..... بیش از یں دل را داغ و جان را بی دماغ کردہ بود[4]"

میرزا صاحب کا عقیدہ اہل سنت و جماعت کا تھا، متعدد شیعے ان کے فیض صحبت سے سنی ہو گئے تھے، چنانچہ وہ "سنی تراش" کے لقب سے مشہور رہتے[5]، مریدوں کو نصیحت تھی کہ "بالتزام عقیدۂ اہل سنت و جماعت حدیث و فقہ آموزند[6]" ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ "بر ملازمت عقیدۂ اہل سنت و جماعت از ظلمت ہوا و بدعت بدر آید[7]"

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بست و ششم ص ۴۰ [2] ایضاً مکتوب پنجاہ و پنجم ص ۵۳ [3] ایضاً مکتوب پنجاہ و پنجم ص ۵۳ [4] ایضاً پنجاہ و پنجم ص ۵۳ [5] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۱۳۱ [6] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۸۸ [7] ایضاً ص ۸۹۔

انھوں نے ایک مختصر سا رسالہ بھی تنبیہات خمسہ کے نام سے مذہب اہل سنت کی حقیقت اور شیعیت کے رد میں لکھا تھا[1]

مولوی نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ مولوی غلام یحییٰ نے حضرت میرزا مظہرؒ کے ایما پر ایک رسالہ کلمات الحق کے نام سے لکھا جس میں وحدت وجود اور وحدت شہود کے مسئلہ سے بحث کی ہے خود میرزا صاحب نے اس رسالہ کو پڑھ کر چند سطریں بطور اظہار خوشنودی لکھیں[2]، مرید ہونے کے علاوہ مولوی غلام یحییٰ نے یہ رسالہ چونکہ میرزا صاحب کے ایما سے لکھا اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک میرزا صاحب کے خیالات کا پرتو ہیں، مولوی غلام یحییٰ لکھتے ہیں کہ مسئلۂ وحدت وجود و مسئلۂ وحدت شہود عقائد دین کے ان مسئلوں میں سے نہیں ہیں جن پر ایمان و اسلام کی بنیاد قائم ہے، یہ دونوں مسئلے حادث و قدیم کے ربط کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں اور کتاب و سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ عالم حادث و مخلوق ہے اور خدائے تعالیٰ اس کا خالق ہے اور قدیم ہے، لیکن یہ کہ صانع و مصنوع دونوں علاقۂ عینیت سے مربوط ہیں، یا غیریت محض سے، شرع کی زبان اس سلسلہ میں خاموش ہے[3] ملفوظات میں بھی ہے کہ،

"مسئلہ توحید وجودی از ضروریاتِ دین نیست، لسان شرع ازاں ساکت است؛ صوفیہ علیہ از روی کشف و وجدان بیان آں نمودہ از غلبۂ احوال محبت معذور اند، ممارست رسائل توحید و تخیل معنی لاموجود الا اللہ توحید حاصل نمودن نزد

---

[1] یہ رسالہ مکاتیب میرزا مظہر میں ضمیمہ کے طور پر شائع کیا گیا ہے، [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۰۲، [3] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۷۱،

ارباب معرفت وقتی ندارد[1]،

میرزا صاحب طہارت وپاکیزگی اور اسباغ وضو کا بہت خیال رکھتے تھے پیروں کو دھونے میں خصوصاً بہت احتیاط (مبالغہ) کرتے تھے، ہمیشہ باوضو رہتے اور اپنے مریدوں کو بھی باوضو رہنے کی تاکید کرتے، فرماتے تھے کہ دوام وضو لوازم طریقہ میں داخل ہے، کھانے اور سونے کے اوقات میں خصوصاً سالک کو باوضو ہونا ضروری ہے، کوئی مجبوری ہو تو تیمم کر لینا چاہیئے، نماز ہمیشہ تازہ وضو سے پڑھتے، پانچوں وقت کی نماز مستحب اوقات میں ادا کرتے، اور رکوع وسجود وقیام میں غایت اعتدال سے کام لیتے، فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اسی اعتدال واقتصاد سے عبارت ہے[2]،

نماز تہجد کے لئے آدھی رات یا اس کے کچھ دیر بعد اٹھتے، پہلے ادعیۂ ماثورہ پڑھتے، پھر وضو کرتے اور دوگانۂ خفیفہ ادا کرنے اور سو بار استغفار کرنے کے بعد نماز تہجد میں مشغول ہو جاتے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد جو مرید حاضر ہوتے انھیں توجہ دیتے، اگر کچھ رات باقی ہوتی تو استراحت فرماتے پھر اول وقت نماز صبح کے لئے اٹھ بیٹھتے اور تجدید وضو کے بعد جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے[3]،

فرمایا کرتے تھے کہ سالک کے لئے توفیق توبہ وتصحیح عقیدہ کے بعد شب وروز میں ۸۰ رکعت نماز لازمی ہے، ۱۷ رکعت فرض، ۱۲ رکعت سنت مؤکدہ، ۲ رکعت اشراق، ۴ رکعت چاشت، ۴ رکعت سنت قبل العصر (اگر ۴ رکعت پڑھیں تو بہتر ہے)، ۶ رکعت اوابین، ۲ رکعت استخارہ بعد اشراق، ۱۰ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر[4]،

---

[1] کلمات طیبات، لمفوظات میرزا صاحب، ص ۱، [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۸۴-۸۵ [3] ایضاً، ص ۸۹ [4] ایضاً، ص ۸۷،

صلوٰۃ التسبیح کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ اس کے ادا کرنے سے انسان کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اگر خدا توفیق دے تو ہر روز صلوٰۃ التسبیح ادا کرے، ورنہ ہفتہ میں ایک بار یا مہینہ میں ایک بار یا سال میں ایک بار یا عمر میں ایک بار ضرور ادا کرے[1]۔

جمعہ کے روز امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، اس لئے اُس دن خاص اہتمام کرتے، مثلاً لباس لطیف دپوشاک نفیس پہنتے، عطر لگاتے، بالوں میں کنگھی کرتے، آنکھوں میں سرمہ لگاتے، نماز اول وقت میں ادا کرتے، خطبہ مختصر اور نماز طویل پڑھتے، فرمایا کرتے تھے کہ حدیث کی رو سے لمبی نماز اور مختصر خطبہ دانشمندی کی بات ہے، کبھی کبھی نماز جمعہ کے بعد صرف دو رکعت سنت پر اکتفا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ بھی سنت نبوی ہے، نماز کے بعد رسول پاکؐ اور خلفاے راشدینؓ کے نام فاتحہ پڑھتے، اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ پر درود بھیجتے، اس کے بعد مراقبہ میں جاتے اور پھر جو مرید حاضر ہوتے انھیں توجہ دیتے، اس کے بعد مکان تشریف لے جاتے[2]۔

اپنے مریدوں اور دوستوں کو نماز اور نماز باجماعت کی تاکید فرماتے جس کو اس کے خلاف پاتے اس سے ناراضگی کا اظہار کرتے[3]، انھیں نماز تہجد ادا کرنے کی بھی ترغیب دلاتے، فرمایا کرتے تھے کہ نماز فرض کے بعد نماز تہجد سے بڑھ کر کوئی نماز نہیں، کیونکہ اس کی ایک رکعت دوسری نمازوں کی ہزار رکعت سے بہتر ہے، اس لئے سالک کو چاہئے کہ اس کی ادائگی میں تساہل نہ کرے بلکہ اسے فرائض پنجگانہ کی طرح ادا کرے اور اگر اتفاق سے قضا ہو جائے تو دن میں ادا کرے اور توبہ واستغفار کرے[4]۔

رمضان شریف میں ہر شب کلام پاک ضرور سنتے اگر کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۹۶ [2] ایضاً ص ۱۳۰ [3] ایضاً ص ۸۹،

سماعِ قرآن مجید ممکن نہ ہوتا تو تراویح تو بہرحال ترک نہ ہوتی[۱]، فرمایا کرتے تھے کہ ختم قرآن سے سنت تراویح ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ختم قرآن اور تراویح دو علٰحدہ علٰحدہ سنتیں ہیں، ایک کے ادا کر دینے سے دوسری پوری نہیں ہو جاتی[۲]، فرض اور دیگر نمازیں خود پڑھاتے مگر سماع قرآن مجید کے لئے قاری کی اقتدا کرتے[۳]،

ضعف پیری کے باوجود آخر عمر تک روزہ رکھا، سحری محض اتباع سنت کی نیت سے کھاتے تھے، اسی لئے کبھی کبھی صرف ایک گلاس شربت پر قناعت کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ سحری سنت، تقویت بدن و تصفیۂ باطن و توجہ الی اللہ کے لئے ہے، نہ کہ پیٹ بھرنے کے لئے[۴]، عاشورہ اور عرفہ کے دن بھی ضرور روزہ رکھتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ صیام دہر کی فضیلت کے حامل ہیں، اسی طرح عید کے بعد ۶ دن کے روزے اور ہر مہینے میں تین دن کے روزے صیام دہر کی فضیلت رکھتے ہیں[۵]، شعبان کا مہینہ شروع ہوا اور میرزا صاحب ماہ مبارک رمضان کے فضائل بیان کرنا شروع کر دیتے تھے[۶]، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خانقاہ شریف میں طالبان کی کثرت سے اس مہینے میں ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب قدر معلوم ہوتی[۷]، اس مہینے میں میرزا صاحب کا معمول تھا کہ اس ماہ مبارک کے شروع ہونے سے پہلے سفید کپڑے کے تاج مریدوں کو خلعت اجازت دینے کی غرض سے تیار کرا کر رکھتے تھے اور جو لوگ ان کے مستحق ہوتے تھے انھیں عطا فرماتے تھے[۸]،

میرزا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب نسبت خاندان چشتیہ ظہور کرتی ہے تو

---

[۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۹۶ [۲] ایضاً ص ۹۹ [۳] ایضاً ص ۱۰۰ [۴] ایضاً ص ۱۰۱
[۵] ایضاً ص ۱۰۱ [۶] ایضاً ص ۱۰۲ [۷] ایضاً ص ۱۰۲،

مجھے سماع اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ عشق و محبت کا سوز و گداز اس سلسلے کے اکابرین کی خصوصیت ہے اور دل میں بھی گداز پیدا کرتا ہے[۱]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سماع کے قائل تھے اور مجلسِ سماع میں شرکت کرتے تھے، لیکن آگے چل کر وہ اس سے تائب اور تارک ہو گئے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "الحمد للہ فقیر از سماع غیر مباح تائب و سماع مباح را تارک و در عقیدۂ اباحت و غیر اباحت تابع کتاب و سنت است[۲]"

مگر وہ سماع کے منکر نہ تھے۔ ان کا قول تھا کہ "السماع یورث الرقة والرقة تجلب الرحمة پس آنکہ موجب رحمت الٰہی باشد چرا حرام بود و در حرمت مزامیر اختلافی نیست مگر دف را در اعراس مباح گفتہ اند و نی را مکروہ[۳]"

میرزا صاحب کا تارکِ سماع ہونا اصول تصوف کے عین مطابق تھا جب سالک کو مشاہدۂ محبوب ہونے لگتا ہے تو پھر اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ یہاں حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان نقل کر دینا دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا، وہ خواجہ ابو احمد المظفر کے فیض صحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"ایک روز سخت گرمی کے موسم میں پریشان حال ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے پوچھا، ابو الحسن کیا چاہتے ہو؟ عرض کیا سماع، انھوں نے فوراً قوال کو بلوایا، مجلس سماع شروع ہوئی تو مجھ پر بڑی بے قراری طاری رہی، جب مجھے کچھ سکون ہوا تو پوچھا کہ سماع کا مزہ کیسا رہا، میں نے

---

[۱] شاہ غلام علی: مقامات مظہری ص ۸۰ [۲] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب دوازدہم، ص ۲۲ [۳] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۷۱۔

عرض کیا، اے شیخ بہت اچھا تھا، فرمایا ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ سماع اور کوے کی آواز تمہارے لئے یکساں ہو جائے گی۔ سماع میں قوت اسی وقت تک ہے جب تک مشاہدہ نہیں ہوتا، جب مشاہدہ ہو جائے گا، شوق سماع جاتا رہے گا۔[۱]

میرزا صاحب بہت خلوت پسند تھے، اُن کی خلوت پسندی کا مقصد زہد و اتقا تھا۔[۲] ایک موقع پر مولوی نعیم اللہ بہرائچی کو نصیحت کرتے ہیں "از لزوم خلوت صفای وقت باید نمود، فقیر دریں مدت العمر کہ کسب نمودہ صفای وقت ست و کسی کہ چیزی یافتہ از صفای وقت یافتہ۔[۳]"

میرزا صاحب خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں کوئی کام بغیر استخارہ کے نہ کرتے، سفر میں ہر منزل کے لئے استخارہ کرتے، فرمایا کرتے تھے کہ سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے استخارہ کرے، اگر دو رکعت نماز استخارہ کی فرصت نہ ملے تو صرف دعا پر اکتفا کرے، نتیجہ یکساں ہو گا۔[۴]

میرزا صاحب کی کتاب اخلاق کا سب سے نمایاں اور ممتاز باب ان کا اتباع سنت رسولؐ پاک ہے، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے اوقات و اعمال کو سنت نبوی کے طریقے پر تقسیم کیا ہے اور اسی پر عمل کرتا ہوں، اگر تم میں سے کوئی میرا کوئی کام خلاف شرع دیکھے تو مجھے متنبہ کر دے۔[۵] سنت نبوی کا اتباع ان میں لڑکپن ہی سے پایا جاتا تھا، چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ اپنے والد ماجد کے ساتھ ان کے مرشد شاہ

۱ے شیخ علی ہجویری، کشف المحجوب ص ۱۰۰ ۲ے مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۲۰۔
۳ے ایضاً ص ۱۱، ۴ے ایضاً ص ۹۲ ۵ے شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۳۵۔

عبدالرحمٰن قادری) کی خدمت میں حاضر تھے، شاہ صاحب مجلس سماع میں جذب کی حالت میں تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ عصر و مغرب کی نماز قضا ہو گئی، میرزا صاحب نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ اگر والد ان سے بیعت کے لئے کہیں گے تو ہرگز نہ کروں گا[1]۔

بعض مکاتیب میں بھی سنت کے اتباع پر زور دیا ہے، مثلاً ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں "کاری غیر از ترویج سنت، شریعت و طریقت از زندگی مقصود نیست ۔۔۔۔ حق تعالیٰ ما و شمار ا بر اتباع سنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والتحیہ استقامت روزی کند[2]"۔ ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں: "ہر مریضی کہ طالب صحت کاملہ یعنی نسبت محمدیہ باشد باید کہ اتباع سنت نبویہ را بہتر از جمیع مجاہدات و ریاضات شناسد و انوار و برکاتیکہ بر آں مترتب گردد افضل از ہمہ فیوضات داند[3]"۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھتے ہیں کہ "دریں ایام بر خاطر فسق اتباع سنت بسیار مستولی است[4]"۔

مولوی نعیم اللہ بہرائچی کو نصیحت کرتے ہیں کہ "ہمیشہ احوالِ خود را بر کتاب و سنت عرض نماید[5]"۔

ایک موقع پر اپنے طریقے (طریقۂ مظہریہ) کے متعلق بتاتے ہیں کہ "بنای ایں طریق بر اتباعِ سنت و اجتناب از بدعت نامرضیہ است[6]"۔

ان کی اپنے پیرووں کو یہ نصیحت تھی کہ "جہد باید کرد کہ اوقات موافق سنت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم مضبوط گردد[7]"۔

---

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ، [2] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بنجاہم، ص ۵۱ [3] ایضاً، مکتوب بست دیکم، ص ۳۵ [4] ایضاً، مکتوب ہفتاد و نہم، ص ۷۰ [5] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۱ [6] ایضاً، ص ۴۴ [7] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۷۳۔

ملفوظات میں نصائح و وصایا کے عنوان سے جو کچھ درج ہے اُس کا پہلا ہی جملہ یہ ہے "طریق ورع و تقویٰ پیش گیر و مطابقت مصطفیٰ بجاں بپذیر صلی اللہ علیہ وسلم"[1] آگے چل کر پھر فرماتے ہیں، "احوالِ خود بر کتاب و سنت عرض نماید"[2] ایک اور موقع پر نصیحت کرتے ہیں، "عمل بہ نیت اتباع حبیب خدا یا بہ محض رضای مولا اختیار کن"[3]

اپنے وصیت نامے میں سب سے پہلی وصیت جو اپنے معتقدین و مریدین کو کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "در تجہیز جنازہ و دفن فقیر دقیقہ ای از سنت فرو نہ گذارند"[4] آخر میں پھر کہتے ہیں کہ "مخلصان مرا ہمیں وصیت جامعہ کافی ست کہ تا دم اخیر در اتباع سنت بکوشند و مقصود حقیقی غیر از اللہ و متبوع واجب الاتباع غیر از رسول اللہ ندانند"[5]

یہ اتباع سنت ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک بار قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھا تھا کہ اگر تمہاری سچائی اور حق گوئی لوگوں کی دل آزاری کا باعث ہے تو ایسی سچائی اور حق گوئی سے باز آؤ[6] ایک اور مکتوب میں غالباً قاضی صاحب ہی کو لکھتے ہیں کہ "در وعظ و نصیحت خشونت نہ کنید و باستمالت بسر برید"[7]

یہ تلقین و نصیحت تعلیم و عمل رسول پاک کے عین مطابق ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، طریقۂ مظہریہ کے بہ جہت کمال متابعت سنت بہت مداح تھے[8] اور خطوط میں میرزا صاحب کو "قیم طریقۂ احمدیہ" اور "داعی سنت نبویہ" کے القاب سے مخاطب کرتے تھے، حاجی فاخر الہ آبادی ایک بڑے پایہ کے محدث گذرے

---

[1] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۸۰ [2] ایضاً، ص ۸۰ [3] ایضاً، ص ۸۰، [4] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۴۴، [5] ایضاً ص ۵۴ [6] کلمات طیبات، مکتوب میرزا صاحب، مکتوب ہفتاد ہفتم ص ۶۴ [7] ایضاً، مکتوب ہفتاد و ہشتم، ص ۶۵، [8] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۹،

ہیں، وہ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اتباعِ سنت کے لحاظ سے میرزا صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔[۱]

میرزا صاحب کے عادات و اطوار پر جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اگر غور کیا جائے تو ان میں سنت نبوی کی پیروی سراسر ملتی ہے، ہر شخص کو نیکی سے یاد کرنا، ہر شخص سے محبت و شفقت، تواضع اور خندہ پیشانی سے پیش آنا، نرمی سے گفتگو کرنا، غیبت اور بدگوئی سے بچنا، کبھی اپنا ذاتی مکان نہ بنوانا، غایت پاکیزگی و طہارت اور اسباغِ وضو کا خیال رکھنا، یہ تمام باتیں سنت نبوی کا اتباع ہیں، غرض میرزا صاحب کا ہر کام سنت نبوی کے مطابق ہوتا تھا، اور یہی ایک مسلمان کا بہترین حاصلِ زندگی ہے، اسی لئے ایک موقع پر میرزا صاحب نے فرمایا تھا کہ "حاصلِ ایں ہمہ تکلفات تہذیب اخلاق است بر طبق مکارم صفات رسول کریم فانہ لعلی خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم۔"[۲]

میرزا صاحب کی کتاب اخلاق کا دوسرا درخشاں باب اُن کا توکل و استغنا ہے، مولوی نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ وہ دنیا داروں سے بہت کم میل جول رکھتے تھے،[۳] خود میرزا صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے،

اگرچہ حسن پرست ست پارسای خوش ست ۔۔۔ نہ کرد میل بدنیای قحبہ مظہر ما

گردیزی میرزا صاحب کے معاصر ہی نہیں بلکہ ہم مشرب بھی تھے، وہ میرزا صاحب کے توکل و استغنا کا اس طرح سے اعتراف کرتے ہیں کہ "انھوں نے بلند منشی سے توکل اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی اور والاہمتی سے اپنا سرِ استغنا کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے نہیں جھکایا۔"[۴]

---

[۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۷۹ [۲] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۷۸،

[۳] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۱۲۰، [۴] فتح علی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۳۱،

میرزا صاحب کے ایک دوسرے ہم عصر قدرت اللہ شوق کا بیان ہے کہ اکثر اہل دول ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے، لیکن انھوں نے ان میں سے کسی سے بھی ربط نہ رکھا۔[۱]

مصحفی بھی میرزا صاحب کے معاصر اصغر تھے، وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اسّی سال کی عمر تک بڑی بے نیازی اور عزت و وقار کے ساتھ زندگی بسر کی، بادشاہ سے لے کر فقرا تک میں سے ہر ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے ان کی آستاں بوسی کو اپنے لئے موجب افتخار نہ سمجھا ہو۔[۲]

وقت کے متعدد ارکان حکومت جن میں نجیب الدولہ، مجد الدولہ، عماد الملک وغیرہ جیسے ارباب اقتدار و اختیار شامل تھے، میرزا صاحب سے نیازمندانہ تعلقات رکھتے تھے، نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کی جوان سے بیعت بھی تھا، نیازمندی کا یہ حال تھا کہ ایک بار جب میرزا صاحب اس کے یہاں سے رخصت ہونے لگے تو اس نے چاہا کہ ان کے جوتے سیدھے کر دے، لیکن اس کے لڑکے نے (جو آگے چل کر عالمگیر ثانی کا وزیر ہوا اور ہندوستان کی تاریخ میں نواب عماد الملک کے لقب سے مشہور ہوا) دوڑ کر جوتے سیدھے کر دیئے، فیروز جنگ نے اس پر خفگی کا اظہار کیا۔[۳] نواب نجیب الدولہ کو ان سے اس قدر عقیدت تھی کہ اس نے ان سے خواہش کی تھی کہ وہ اس کے علاقے میں رہیں، اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار زبانی بھی کیا تھا اور خط کے ذریعہ بھی[۴]، لیکن میرزا صاحب نے ان ارباب اختیار و اقتدار سے تعلقات قائم رکھنے میں ہمیشہ اپنی مرزائیت اور درویشی کو برقرار رکھا، انھوں نے نہ صرف ان سے ملنے جلنے میں احتیاط برتی بلکہ خط و کتابت میں بھی وہ محتاط رہے، مثلاً قاضی

---

[۱] تکملۃ الشعراء، قلمی [۲] عقد ثریا، ص ۵۵ [۳] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارات مظہریہ، ق ۹۱ [۴] عبد الرزاق قریشی، مرتبہ، مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۱۶، ص ۲۲-۲۱،

ثناء اللہ پانی پتی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "فقیر را باؤ اب رسم تحریر و طلب امداد معمول نیست"[1]
قاضی ثناء اللہ پانی پتی ہی کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: بجانب مجد الدولہ ... کہ تغیر مزاج ایشاں در عروج مراتب مشہور است، و نوشتن مناسب وضع فقیر نیست ... اگر مجد الدولہ اخلاصی دارد و حرکتی از طرف او واقع شود، البتہ مرقوم خواہد شد[2]"

متعدد شہزادوں اور امیروں نے مسجد و خانقاہ بنوا دینے کی خواہش ظاہر کی، لیکن انھوں نے قبول نہ فرمایا، بعض امرائے نامور نے قرابت کی خواہش ظاہر کی، وہ بھی قبول نہ ہوئی، بادشاہ وقت بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن اس چیز نے ان کو کبھی بھی متاثر نہیں کیا اور نہ وہ ان سے کبھی مرعوب ہوئے[3]

یہاں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں، جن سے میرزا صاحب کے توکل و استغنا اور دنیا سے بے تعلقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ محمد شاہ نے اپنے وزیر قمر الدین خاں کی زبانی کہلا بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکومت بخشی ہے، آپ کا جو جی چاہے بطور ہدیہ قبول فرمائیے، میرزا صاحب نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، متاع الدنیا قلیل ط جب ساری دنیا قلیل ہے اور تم کو اس قلیل کا ساتواں حصہ ملا ہے، تو تمھارے پاس ہے ہی کیا جس کے لئے فقیر کا سر جھکے گا[4]،

ایک امیر نے حویلی و خانقاہ بنوائی اور فقرا کے لئے وجہ معاش خدمت میں پیش کی، آپ نے قبول نہیں فرمایا[5]

ایک روز سخت سردیوں کے دنوں میں ایک پرانی چادر کاندھے پر ڈالے ہوئے تھے،

---

[1] عبد الرزاق قریشی، مرتبہ مکاتیب میرزا مظہر، مکتوب ۸۰، ص ۱۲۰، [2] ایضاً مکتوب ۷۶، ص ۱۱، [3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۴۸، [4] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۴۷، [5] ایضاً

نواب خاں فیروز جنگ بہادر حاضر مجلس تھے، پرانی چادر دیکھ کر آنکھیں نمناک ہوگئیں، اپنے ایک مصاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ یہ ہماری بدبختی کی دلیل ہے کہ وہ بزرگ جن کی خدمت میں ہم کو ارادت و بندگی حاصل ہے ہمارا تحفہ قبول نہیں فرماتے، میرزا صاحب نے فرمایا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ مالداروں کا تحفہ قبول نہیں کروں گا، اب کہ میری زندگی کا آفتاب لب بام آچکا ہے اپنے اس عہد کو کیسے توڑ سکتا ہوں[1]۔

ایک مرتبہ نظام الملک آصف جاہ نے تیس ہزار روپئے بطور نیاز پیش کئے، میرزا صاحب نے قبول کرنے سے انکار کردیا، نظام الملک نے کہا اسے لے کر راہ خدا میں تقسیم کردیجئے، فرمایا میں تمہارا خانساماں نہیں ہوں، یہاں سے تقسیم کرنا شروع کردو، گھر پہنچتے پہنچتے ساری رقم ختم ہوجائے گی[2]۔

ایک مرتبہ ایک افغان سردار نے تین سو اشرفیاں بھیجیں، لیکن میرزا صاحب نے حسب معمول قبول کرنے سے انکار کردیا[3]،

اسی توکل و استغنا کا نتیجہ تھا کہ وہ تاہل، و مرض دائمی متعلقان وفساد زمان و ویرانی شہر کے باوجود اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے[4]،

وہ امیروں کی دعوت بھی قبول نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر کبھی اتفاق سے کسی امیر کے گھر کا کھانا کھالیتا ہوں تو نسبت باطنی مکدر ہوجاتی ہے، اسی بنا پر وہ مجالس متعارفہ صوفیہ میں شرکت نہیں کرتے تھے، یوں بھی وہ دعوت بہت کم قبول کرتے تھے، ان کا قول تھا کہ اگرچہ دعوت کا قبول کرنا سنت ہے، لیکن اس زمانہ میں جب کہ نیتوں

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۳۲ [2] ایضاً ص ۴۳ [3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی: معمولات مظہریہ، ص ۱۲۷ ، [4] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۲۷ ،

میں فساد و شر پیدا ہو چکا ہے اس کا قبول نہ کرنا بہتر ہے، لوگوں کے اپنے ہی کھانے کا ٹھکانا نہیں تو پھر دعوت کا کیا سوال، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سود پر قرض لے کر دعوت کرتے ہیں، اب اس دعوت کی شرعی حیثیت کہاں رہی [۱]، لیکن مخلص دوستوں اور نیاز مندوں کی دعوت بلا تکلف قبول کر لیتے تھے [۲]، اس سلسلے میں مولوی نعیم اللہ بہرائچی کا مندرجہ ذیل بیان دلچسپی سے پڑھا جائے گا،

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ (م ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء) کا جو میرزا صاحب کا مرید تھا، یہ معمول تھا کہ جب کبھی وہ کوئی نئی عمارت بنوانے یا خانہ باغ لگوانے کا ارادہ کرتا تو پہلے میرزا صاحب کی دعوت و ضیافت کرتا، اور تقریب سے تین دن پہلے مسلسل تین دن روزہ رکھتا، اور تھوڑی سی آش سے افطار کرتا، دعوت سے ایک دن پہلے بادشاہ کی خدمت میں کہلا بھیجتا کہ کل مجھے ایک ضروری کام ہے، اس لئے میں حاضری خدمت سے معذور رہوں گا، ملازموں سے کہتا کہ کل میرے پاس کوئی نہ آئے، جب میرزا صاحب کے لئے سواری بھیجتا تو اسی وقت سے دروازے پر کھڑا ان کا انتظار کرتا، کھانے پینے کا اہتمام محل خاص کے ذمہ ہوتا، وہ بھی میرزا صاحب سے بیعت تھیں، نواب کہا کرتا تھا کہ یہ اہتمام میں اس لئے کرتا ہوں کہ حضرت میرزا صاحب کا مزاج ہماری بشری ظلمت و کدورت کی وجہ سے متغیر نہ ہو، وہ میرزا صاحب کو محل خاص میں لے جا کر خدمت و ضیافت کی عزت حاصل کرتا اور جو کچھ کہنا ہوتا کہتا [۳]

---

[۱] کلماتِ طیبات، ملفوظات میرزا صاحب ص ۸۰ [۲] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۱۰ [۳] بشارات مظہریہ، ق ۹۱ .

وہ امیروں کے تحفے قبول کرنے سے بھی احتراز فرماتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ امراد وسروں کا مال غصب کرتے ہیں، چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک امیر نے کچھ آم ان کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، انھوں نے حسب معمول قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس نے بہت الحاح ومنت کے ساتھ پھر بھیجا، انھوں نے اس میں سے صرف دو آم لے لئے، اور باقی واپس کر دیئے، تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک باغبان دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ فلاں امیر نے جبراً میرے باغ سے آم توڑے اور حضور کو ہدیۃً بھیجے، میرزا صاحب یہ سن کر بہت مکدر ہوئے[1]،

لیکن اگر دوست احباب ازراہ اخلاص و احتیاط ہدیہ پیش کرتے تو اسے قبول کر لیتے[2]،

دنیا سے اسی بے تعلقی کا نتیجہ تھا کہ وہ عمر بھر کرایے کے مکان میں رہے، اپنا ذاتی مکان کبھی نہ بنوایا[3]، اگرچہ میرزا صاحب کے وصیت نامے سے پتہ چلتا ہو کہ ان کی حرم محترم نے آخری عمر میں ایک حویلی خریدلی تھی لیکن خود میرزا صاحب کو وہ قطعی ناپسند تھی، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں، "من بجاں ازاں بقعہ بیزارم[4]"

مولوی نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں کہ کھانا ہمیشہ بازار سے منگوا کر کھاتے[5]، یہ بیان مشتبہ ہے، خود میرزا صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ آج کل کھانا مولوی غلام یحییٰ کے یہاں سے پک کر آتا ہے، جنس یہاں سے بھیج دی جاتی ہے[6]، مولوی نعیم اللہ ہی کا بیان ہے کہ میرزا صاحب اتباع سنت کے پاس سے صرف ایک جوڑا کپڑا رکھتے[7]، لیکن میرزا صاحب

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۲۵ [2] ایضاً، ص ۴۳ [3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۲۰، [4] ایضاً ص ۵۴، [5] ایضاً، ص ۱۲۰، [6] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب سی ودیکم، ص ۲۴ [7] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۲۰،

کی نفاست پسندی و میرزائیت (جس میں کوئی اختلاف رائے نہیں) کو جانتے ہوئے یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی، شاید مرید نے جوشِ عقیدت میں یہ جملہ لکھ دیا ہے۔ میرزا صاحب کے ایک مکتوب کا یہ جملہ کہ "فقیر سالا جامۂ کم قیمت استعمال می کند"[۱] اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ کبھی قیمتی کپڑے پہنا کرتے تھے اور قیمتی کپڑے پہننے والے کے پاس ایک ہی جوڑا کپڑا نہیں ہوتا۔

نذر و نیاز کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں کہ مشکل سے پوری ہو سکتی تھیں، وہ شرطیں یہ تھیں[۲]

(۱) پیش کرنے والا نجیب و شریف ہو۔

(۲) دنیا داروں سے میل جول نہ رکھتا ہو،

(۳) صالح و پرہیزگار ہو،

(۴) حلال و حرام میں تمیز کر سکتا ہو،

(۵) ایسے ملک سے تازہ وارد نہ ہو جہاں لوٹ مار ہوتی ہو،

(۶) اخلاص و عقیدت سے پیش کرتا ہو۔[۳]

وہ صرف یہی نہیں کہ امیروں کے تحفے اور ہدیے لینے سے انکار فرماتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ان لوگوں سے ملنے سے بھی احتراز کرتے، اس کے اشارات ان کے بعض مکاتیب میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "دوندے خاں[۴] ارادۂ ملاقات فقیر داشت منع کردم کہ نباید و حافظ رحمت خاں[۵] کہ پیش فقیر حاضر شدہ بود صحبت

۱؎ کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب سی و ششم، ص ۴۴ ۲؎ کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۸۰ ۳؎ مشہور روہیلا سردار، ۴؎ ایضاً

او با فقیر نادرست افتاد[۱]"

نواب عماد الملک ان سے ملنے کا آرزو مند ہے، اولاً تو نواب کی یہ آرزو ان کے لئے باعثِ شرمندگی ہے، اور دوسرے وہ اس سے محض ان شرائط پر ملنے کے لئے رضامند ہیں،

"بخاطر است وقت مراجعت بخانہ از راہ متھرا بگذرم و در متھرا توقف نمودہ خبر ورودِ خود برسانم و ایشاں در متھرا بیایند و بیک دو روز ملاقات نمودہ فقیر را رخصت نمایند، بشرط آنکہ فقیر در قلعہ جات ہرگز داخل نخواہم شد و شرط دیگر آنست کہ تادم آب مدارای نواب قبول نخواہم نمود[۲]"

نواب خان خاناں خلف نواب قمر الدین وزیر کو لکھتے ہیں کہ

"امرای ایں جہاں را باید کہ با سلاطین آں جہاں یعنی فقرا با ادب باشند خصوصاً دراوقات استمداد و استعانت کہ دل فقرا ملتفت گردد، درچنیں اوقات بے پروائی کردن و تحریر مطالب بعمدۂ بے ادباں گذاشتن ضرر دارد، اگر حسن ظن دمیان است ادب واجب است و اگر نیست رجوع و انابت چہ ضرور است، باندیشۂ ہمیں اختلاط و رسم مراسلت ترک نمودہ ایم و دعا گفتہ ایم[۳]"

حقیقت یہ ہے کہ میرزا صاحب بقول مولوی نعیم اللہ بہرائچی "در مشاہدۂ ذات چناں مستغرق بودند کہ پروای کون و مکان نداشتند[۴]"

میرزا صاحب کی یہ رباعی بھی ان کے توکل و استغنا کی طرف اشارہ کرتی ہے،

---

۱ کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب پنجاہ و چہارم ص ۵۳ ۲ ایضاً، مکتوب شصت و ششم ص ۵۸، ۳ ایضاً، مکتوب شصت و یکم، ص ۵۶ ۴ مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولاتِ مظہریہ، ص ۱۲۹،

مظہر تشویش چشم و گوشی نشوی — سرمایۂ جوش و خروشی نشوی

باید کہ بپای خود روی تا سر گور — ای جوہر پاک بار دوشی نشوی

بعض اور اشعار میں اپنے استغنا کی طرف نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے،

ما والیٔ قلم رو سیر و سیاحتیم — ہر نفس پای خویش بود پای تخت ما

پادشاہ عالم ویرانہ ام مانند سیل — کردہ ام تخت روان طبع روان خویش را

ز شرم آنکہ پیش تشنہ کاماں تر شود مظہر — بلب جانش گر آید نام جام جم نمی گیرد

اگر مظہر باین ہمت ز خضر آب بقا خواہد — ز ننگ زندگانی تا دم مردن خجل باشد

سیر مہتاب بہ ویرانہ سلامت مظہر — بر مزار تو شب عرس چراغاں نہ کنم

وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بھی توکل و استغنا کی تلقین و تاکید کرتے اور اہل دنیا سے ضرورت سے زیادہ میل جول بڑھانے پر ناراضگی کا اظہار فرماتے،[۱] فرمایا کرتے تھے کہ مجھے محض دو باتوں کی بنا پر اپنے مریدوں کی طرف سے ناامیدی ہوتی ہے، ایک دنیا داروں سے ضرورت سے زیادہ میل جول اور دوسرے پیروں سے سوے اعتقاد[۲]، ایک مکتوب میں ایک مرید کو تنبیہ فرماتے ہیں، "توسل بپادشاہ حال کہ نمودند ما ل آں خوب نیست و احوال ایں دنیا داران ما کو رباطناں را کی مفصل معلوم می شود؟ اگر شود تحریر آں موجب فساد است. ایں قدر ہم برعایت خاطر شما گاہ می نویسم[۳]"

اپنے وصیت نامہ میں بھی لکھتے ہیں کہ "مخلصان مرا از رسوم درویشان متعارف و اختلاط با دنیا داراں در اجتناب و احتراز باشند[۴]"

---

[۱] شاہ غلام علی، مقامات مظہری ص ۷۰ [۲] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۸۰ [۳] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہل و یکم، ص ۸۴ [۴] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۱۴۵،

میرزا صاحب امیروں اور دنیاداروں سے ضرور الگ تھلگ رہتے تھے، لیکن غریبوں، عزیزوں اور مخلص دوستوں سے بڑی محبت سے ملتے تھے، چنانچہ ان کے ہم عصر احمد علی سندیلوی کا بیان ہے کہ وہ غریبوں سے بڑی تواضع سے پیش آتے تھے[1]، خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ "اوقات خود بر علم و عمل و صحبت احباب تقسیم نمودہ ایم[2]"

اس سے قبل میرزا صاحب کے حسن اخلاق کے سلسلہ میں میر تقی میر، قدرت اللہ شوق، بندرابن خوشگو، انشاء اللہ خاں انشاء وغیرہ کے تأثرات نقل کیے جا چکے ہیں، ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں سے بہت اچھی طرح ملتے تھے، وہ صرف مالداروں یا دوسرے لفظوں میں نخوت پسندوں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے،

میرزا صاحب میں تنگ نظری بالکل نہ تھی، اوپر بندرابن کا بیان نقل کیا جا چکا ہے، کہ میرزا صاحب رات کو ان کے یہاں قیام کرتے اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ کھانوں کی فرمایش کرتے، ان کے معاصر سراج الدین علی خاں آرزو کا بیان ہے کہ،

"باوجود تقید مذہب کمال توسع مشرب دارد[3]"

اسی وسعت مشرب کا نتیجہ ہے کہ وہ بید کو الہامی کتاب مانتے ہیں، اور جن اکابر کا اس کتاب میں ذکر ہے انھیں پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، وہ ہندو دھرم کو دین منسوخ مانتے ہیں، اور ہندو بتوں کو جو سجدہ کرتے ہیں وہ ان کی رائے میں سجدۂ تحیت ہے نہ کہ سجدۂ شرک[4]، اسی طرح ملفوظات میں ہے کہ "اہل استدراج را نیز احوال واذواق دست، می دہد وکشف توحید ومکاشفہ ومعائنہ کہ درمرایای صور عالم بہ ظہوری آید نمای

---

[1] احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب (قلمی)، [2] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۲۰، [3] سراج الدین علی خاں آرزو، مجمع النفائس، قلمی، [4] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہاردہم، ص ۲۷.

یونان و براہمۂ ہند دریں معنیٰ شریکند[۱]۔"

اس وسعتِ مشرب اور حسنِ اخلاق کا نتیجہ تھا کہ ہندو بھی بڑی تعداد میں ان کے معتقد تھے، اوپر لکھا جا چکا ہے کہ آخری عمر میں وہ اپنے ایک ہندو معتقد رام کیول بنئے کے مکان میں رہنے لگے تھے، وہ اپنے ہندو نیازمندوں کو اسی طرح سے عزیز رکھتے تھے جیسے مسلمان مریدوں کو،

مولوی نعیم اللہ بہرائچی کا بیان کیا ہوا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے،

ایک بار نواب نجیب الدولہ میرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کا ایک ہندو معتقد بھی اس وقت مجلس میں موجود تھا، نواب کے آدمیوں نے میرزا صاحب کی اطلاع کے بغیر اسے وہاں سے ہٹا دیا، انھیں اس کا علم ہوا تو انھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا، نجیب الدولہ نے فوراً اسے واپس بلوایا اور اس سے معذرت چاہی[۲]،

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ میرزا صاحب کی کتابِ اخلاق کا سب سے نمایاں باب انکا اتباعِ سنت ہے، یہ وسعتِ نظر و مشرب بھی حقیقت میں اسی پیکرِ محبت کی تقلید و اتباع کا نتیجہ ہے،

ملفوظات:

دوسرے صوفیہ کرام کے مریدوں کی طرح میرزا مظہر جان جاناں کے مریدوں نے بھی ان کے بعض اقوال و آرا کو ملفوظات کی شکل میں اکٹھا کر لیا تھا، یہ ملفوظات ان کے مکاتیب کے ساتھ کلماتِ طیبات میں شائع ہو چکے ہیں، میرزا صاحب کے سلسلۂ حالات میں ان کے متعدد اقوال و آرا نقل کئے جا چکے ہیں، جن سے ان کے رجحانات و میلانات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، ان کی تعلیمات و ہدایات اور اعتقادات و خیالات کو بہتر طور پر سمجھنے کی غرض سے یہاں چند مزید اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔

---

[۱] کلماتِ طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، ص ۳۹، [۲] بشارات، ق ۱۰۱،

(۱) ایمان مجمل کہ ایمان آوردم بخدا و رسولؐ و آنچہ پیغمبر از خدا آوردہ است. دوست دارم خدا و رسول را و بیزارم از دشمنان خدا و رسول بجہت نجات کافی است۔

(۱) ایمان مجمل یعنی میں خدا اور رسولؐ، اور رسول کے لائے ہوئے احکام پر ایمان لایا اور خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہوں اور خدا اور رسول کے دشمنوں سے بیزار ہوں، نجات کے لئے کافی ہے،

(۲) اوقات را بذکر و عبادت معمور داشتہ مدرکۂ خود را از التفات بما سوا پاک باید داشت توجہ و ہمت جز بمفہوم اسم مبارک اللہ کہ برآں ایمان آوردہ ایم بہیچ نباید گذاشت تا ملکۂ حضور راسخ گردد و دین کامل کہ اسلام و ایمان و احسان است حاصل شود ہر وقتی کہ بدل متوجہ شود دل را بحق سبحانہ جمع یابد،

(۲) اپنے اوقات کو ذکر و عبادت سے معمور رکھ کر قلب کو غیر اللہ کے تصور سے پاک رکھنا چاہئے، اپنی توجہ و ہمت اللہ جس پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے اسم مبارک کے مفہوم کو سمجھنے کے سوا کسی چیز پر صرف نہ کرنی چاہئے تاکہ ملکۂ حضور راسخ ہو اور دین کامل جو اسلام و ایمان و احسان سے عبارت ہے، حاصل ہو اور جب بھی دل کی طرف متوجہ ہو تو اسے حق تعالیٰ کے ساتھ پائے،

(۳) حاصل این ہمہ تکلفات تہذیب اخلاق است برطبق مکارم

(۳) ان تمام کوششوں کا حاصل اپنے اخلاق کو رسول کریم کے صفات حسنہ

صفات رسول کریم، فانہ لعلیٰ خلقٍ عظیمٍ صلی اللہ علیہ وسلم؛

کے طرز پر سنوارنا ہے،

(۴) استیصال ذمائم ممکن نیست در حدیث وارد است اگر بشنوید کوہ از جا منقطع گشتہ تصدیق نمائید واگر بشنوید کہ کسی از جبلتِ خود برگشتہ باور نکنید، لاتبدیل لخلق اللہ،

(۴) بری عادتوں کا قطعی طور پر ختم ہو جانا ناممکن ہے، حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم یہ سنو کہ ایک پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اسے مان لو، لیکن اگر یہ سنو کہ ایک شخص کی فطرت بدل گئی تو اسے باور نہ کرو کیونکہ خدا کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی نہیں ہو سکتی،

(۵) بعد فنا واطمینان نفس تسلیم ورضا وصف سالک می گردد وفنای قلب از غلبۂ محبت نسبت افعال از عباد مسلوب می شود وجز فاعل حقیقی در شہود سالک نمی ماند.

(۵) نفس کے فنا ہو جانے اور طمانیت قلب حاصل ہونے کے بعد تسلیم ورضا سالک کی صفت بن جاتے ہیں اور غلبۂ محبت سے قلب کے فنا ہو جانے کی وجہ سے افعال کی بندوں سے نسبت سلب ہو جاتی ہے اور سالک کی نظر میں فاعل حقیقی کے سوا کوئی نہیں رہتا،

(۶) توسط وحد اعتدال در اکل وشرب ونوم ویقظہ واعمال و

(۶) کھانے پینے، سونے جاگنے، اور اعمال وعبادت میں اعتدال قائم

عبادت کاری بس مشکل است، جہد باید کرد کہ اوقات موافق سنن خیر البشر مضبوط گردد و بتبعیت انبیا علیہم السلام بجہت تحصیل حد اعتدال است و در ہر امر لیقوم الناس بالقسط نص قاطع است دریں باب،

رکھنا بڑا مشکل کام ہے، اعتدال قائم رکھنے کے لیے اپنے اوقات کو رسول پاک کی سنت کے مطابق اور انبیا علیہم السلام کے تتبع میں گذارنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ہر معاملے میں لیقوم الناس بالقسط (لوگوں کے ساتھ انصاف) نص قاطع ہے،

(۷) از دوام مراقبہ قوت در نسبت باطن و اشراف ملک و ملکوت و بہ نظر موہبت دلہا را نواختن دست می دہد و از کثرت تہلیل فنای بشریت و از کثرت درود واقعات نیک و از کثرت نوافل انکسار و شکست دلی و از کثرت تلاوت نور و صفا ہم می رسد،

(۷) کثرت مراقبہ سے نسبت باطن کی قوت بڑھتی ہے اور ملکوتی صفات اور دلنوازی کی عادت پیدا ہوتی ہے کثرت تہلیل سے فنائے بشریت نصیب ہوتی ہے، کثرت درود سے واقعات نیک رو بکار آتے ہیں، کثرت نوافل سے خاکساری و دل گداختگی پیدا ہوتی ہے، اور کثرت تلاوت سے نور و صفا حاصل ہوتا ہے،

(۸) علم مسائل ضروری خواندن یا در صحبت علما باستماع آموختن

(۸) مسائل ضروری کا جاننا یا علما کی صحبت میں بیٹھ کر ان کا سننا صحت

بجہت صحت عمل لازم است

عمل کے لئے لازمی ہے،

(۹) علم حدیث جامع تفسیر و فقہ و دقائق سلوک است، از برکات این علم نور ایمان می افزاید و توفیق عمل نیک و اخلاق حسن پیدا می شود،

(۹) علم حدیث، تفسیر فقہ اور دقائق سلوک کا جامع ہے، اس علم کی برکت سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور عمل نیک اور اخلاق حسنہ کی توفیق ہوتی ہے،

(۱۰) ظہور خرق عادات شرط علو کمال نیست، اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم باوجود علو درجات کہ ہیچ ولی بآں نتواند رسید مصدر کثرت خوارق عادات و نسبتہای شوق و ذوق و جذبہ و استغراق نبودند،

(۱۰) خرق عادات کا ظہور علو کمالات کے لئے ضروری نہیں، صحابۂ کرام جن کا درجہ اتنا بلند تھا کہ کوئی ولی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن اس کے باوجود ان سے بہت کم خوارق ظہور میں آئے،

(۱۱) ثمرۂ زہد و مجاہدات شاقہ خرق عادات و تصرفات است و حاصل دوام ذکر توجہ الی اللہ و اتباع سنت و کثرت انوار و برکات، عوام ظاہر بیں را نظر بر ظہور خرق عادات بود و خواص

(۱۱) زہد اور سخت مجاہدہ حاصل خرق عادات و تصرفات ہے اور کثرت ذکر کا ماحصل توجہ الی اللہ اور اتباع سنت اور کثرت انوار و برکات، عوام ظاہر بیں کی نگاہ ظہور خوارق پر ہوتی ہے اور خواص

معنی آگاہ را مراد تصفیۂ قلبی
ونسبت مع اللہ باشد

معنی آگاہ تصفیۂ قلبی اور نسبت الٰہی
کے خواہش مند ہوتے ہیں،

(۱۲) ہر عمل را کیفیتی دیگر است
وجامع کیفیات نماز است کہ
متضمن انوار اذکار از تلاوت
وتسبیح ودرود واستغفار است
وصحیح واصیل ترین حالات کہ
باحوال قرن اول مشابہ باشد
در نماز حاصل می شود، اگر آداب
آں کما حقہ بجا آوردہ شود

(۱۲) ہر عمل کی کیفیت جداگانہ ہوتی ہے
اور تمام کیفیات کی جامع نماز ہے کیونکہ
وہ تلاوت وتسبیح اور درود واستغفار
کے انوار کی حامل ہے اور اگر اسے
بجا طور پر ادا کیا جائے تو اس سے
عمدہ اور نیک ترین حالات جو
قرن اول کے بزرگان دین کے
حالات کے مشابہ ہوں، حاصل ہو سکتے
ہیں،

(۱۳) تلاوت قرآن مجید موجب
صفائی باطن ورفع فیض قلبی
است، ترتیل حروف وتحسین
صوت خود می باید نمود ودر جہر
متوسطا کہ در تلاوت قرآن مجید
کردہ باشد ذوقہا دست می دہد

(۱۳) تلاوت قرآن مجید صفائی باطن
اور فیض قلبی کی رفعت کا باعث ہے
اس لئے تلاوت صفائی اور خوش الحانی
کے ساتھ کرنی چاہئے اور اگر کسی
قدر بلند آواز سے تلاوت کی جائے
تو ذوق شوق اور بڑھتا ہے،

(۱۴) در رمضان المبارک ترقیات
نسبت باطنی بسیار واقع می شود

(۱۴) رمضان المبارک کے مہینہ میں
نسبت باطنی کو بہت ترقی ہوتی ہے

واحتیاط صیام از غیبت وکذب واجب است والا روزہ جز فاقہ بیش نیست،

اس مبارک مہینے میں غیبت اور کذب سے بچنا لازمی ہے ورنہ روزہ اور فاقہ میں کوئی فرق نہیں،

(۱۵) شب قدر بر سبیل بدلیت در شبی از شبہای او تا دمی شود بیست وہفتم معین نیست مگر دریں شب بسبب کثرت دعا ونماز کہ در مردم احیای ایں شب معمول است برکات بسیار دریافت میشود وگاہی شب قدر دریں تاریخ نیز می شود جمعیت وحضور ایں ایام ذخیرۂ تمام سال می شود،

(۱۵) شب قدر کا شمار مقدس ترین راتوں میں ہوتا ہے، ستائیسویں تاریخ اس کے لئے معین نہیں لیکن اس رات میں چونکہ نماز ودعا کی کثرت ہوتی ہے اس لئے بہت سی برکتیں نازل ہوتی ہیں، کبھی کبھی شب قدر اسی تاریخ میں پڑتی ہے، ان ایام میں جو حضوری اور جمعیت خاطر نصیب ہوتی ہے وہ پورے سال کا ذخیرہ ہوتی ہے،

(۱۶) عمل بہ اتباع حبیب خدا یا محض رضای مولا اختیار کن دل را از اغراض ہر دو جہاں بیزار کن

(۱۶) تمہارا ہر عمل اتباع سنت کی غرض سے ہونا چاہئے یا رضای مولیٰ کی خاطر اور اپنے دل کو دونوں جہاں کے اغراض سے پاک رکھنا چاہئے،

(۱۷) مخالفت نفس چندانکہ بود زیباست امانہ آں قدر کہ تنگ

(۱۷) نفس کی جتنی بھی مخالفت کی جائے بجا ہے، لیکن نہ اتنی کہ وہ تنگ

آید و نشاط شوق در اطاعت نیفزاید گاہی با او مواسات باید نمود کہ رضای نفس مومن موجب ثواب می گردد،

آجائے اور عبادت میں نشاط شوق نہ پیدا ہو، کبھی کبھی اس کی خواہش پوری کرنی چاہئے کیونکہ رضائے نفس مومن ثواب کا موجب ہے،

(۱۸) طعام اگر بہ نیت ادای شکر بامزہ سازند احسن می نماید کہ در صورت بے مزگی شکر از تہ دل بر نمی آید طعام لذیذ را با آمیزش آب بے مزہ ساختن نعمت الٰہی را بخاک انداختن است

(۱۸) کھانا اگر ادائے شکر کی نیت سے لذیذ پکایا جائے تو یہ فعل احسن ہے کیونکہ جب کھانا بے مزہ ہوگا تو شکر دل سے ادا نہ ہوگا، لذیذ کھانے کو پانی ملا کر بدمزہ کرنا گویا نعمت الٰہی کو ضائع کرنا ہے،

(۱۹) شکری کہ محض بر زبان بود شعبۂ صبر است کہ تلخی آں در جان بود

(۱۹) جو شکر صرف زبان سے ادا کیا جاتا ہے وہ اس صبر کا حصہ ہے جس کی تلخی روح میں ہوتی ہے،

(۲۰) زر نقد خفیہ بارباب حاجت دادن اسرع است بثواب

(۲۰) حاجت مند کی خفیہ طور پر زر نقد سے امداد کرنے سے ثواب جلدی ملتا ہے،

(۲۱) باید کہ قدر و مقدار خود نصب العین دارد تا از مدح مسرور و از ذم مکسور نباشد نیز

(۲۱) آدمی کو اپنی قدر و قیمت خود جاننی چاہئے تاکہ کسی کی مدح سے مسرور اور ذم سے رنجور نہ ہو،

که بیشتر سبب تغیر حال عدم اطلاع بر احوال و مرتبهٔ خود است.

آدمی کی رنجش و ناخوشی کا سبب اکثر و بیشتر اپنے مرتبہ یا حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر ہوتی ہے،

(۲۲) راه اوقات زندگانی بقدم توکل بسر باید برد و اصلاً محتاج و ملتجی بکس نباید شد که در توکل نظر توجه بطرف حق است سبحانه و در غیر توکل بطرف خلق.

(۲۲) زندگی توکل میں گذارنی چاہئے اور کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا چاہیئے، کیونکہ توکل میں نگاہ خدا کی طرف ہوتی ہے، اور غیر توکل میں خلق کی طرف.

بزرگوں اور ہم عصروں کی نظر میں

کسی شخص کی عظمت و مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے بزرگ اس کو کیا سمجھتے تھے اور اس کے ہم عصر اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے،

مولوی نعیم اللہ بہرائچی کا بیان ہے کہ میرزا صاحب کو صوفیہ کے تمام گروہوں میں عزت و مقبولیت حاصل تھی، اور امور متنازع فیہ میں انھیں حکم مانا جاتا تھا،[1]

حضرت سید نور محمد بدایونی کا شمار ہندوستان کے ممتاز اولیا میں ہوتا ہے، وہ میرزا صاحب کے مرشد اول تھے، انھوں نے ایک بار اپنے دست مبارک سے میرزا صاحب کا جوتا درست کیا تھا، میرزا صاحب نے اس پر نیازمندانہ احتجاج کیا تو فرمایا کہ ہم تو سنت نبوی کی اتباع کرتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی اکثر خدمت کی تھی[2]

[1] بشارات مظہریہ، قلمی، ق ۸۵، [2] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ ص ۸،

حافظ سعد اللہ بھی میرزا صاحب کے پیر تھے، وہ ان کی تواضع میں کھڑے ہو جاتے تھے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کی مدح سرائی اس طرح کی ہے،

"آنچہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم شما چہ دانید۔ احوال مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاء فقیر است و بلاد عرب را نیز دیدہ ایم و سیر نمودہ احوال مردم ولایت از ثقات آنجا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزی کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہمچنیں استوار و مستقیم باشد و در ارشاد طالبان ثانی عظیم و سعی قوی دارد و دریں جزو زمان مثل ایشاں در بلاد مذکور یافتہ نمی شود مگر در گذشتگان بلکہ در ہر جزو زمان وجود ایں چنیں عزیزان کمتر بودہ است چہ جای ایں زمان کہ پر فتنہ و فساد است۔"[2]

شاہ صاحب نے میرزا صاحب کے نام جو مکاتیب لکھے ہیں اُن میں جو آداب و القاب استعمال کئے ہیں ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ میرزا صاحب کو کتنے احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مثلاً ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "خدای عزوجل آں قیم طریقۂ احمدیہ داعی سنت نبویہ را دیرگاہ داشتہ مسلمین را متمتع و مستفید گرداناد"[3]

ایک دوسرے مکتوب میں انھیں اس طرح یاد کرتے ہیں، "خدای عزوجل آں قیم طریقۂ احمدیہ خصوصاً و طریقۂ صوفیہ عموماً و آں متحلی بانواع فضائل و فواضل را دیرگاہ سلامت داشتہ انواع ابواب برکات بر کافۂ انام مفتوح گرداناد"[4]

---

[1] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب حاشیہ [2] کلمات طیبات، مکتوبات شاہ ولی اللہ صاحب، مکتوب اول ص ۱۵۸ [3] ایضاً مکتوب دوم ص ۱۵۹،

اس ضمن میں احمد علی سندیلوی کا یہ بیان بھی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتا ہے، "شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہ در مکہ ملقب بہ شیخ الہند است در کمال ادب با او بسر می برد۔"[1]

یہاں تک تو ان بزرگوں کی باتیں ہوئیں جن کے بیانات میں ممکن ہے بزرگانہ شفقت و محبت کے جذبات شامل ہوں، دیکھنا ہے کہ میرزا صاحب کو ہم عصر شعرا اور تذکرہ نگاروں کے حلقے میں کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اعلیٰ کسوٹی یہی ہوتی ہے،

میر غلام علی آزاد بلگرامی ہمارے ملک کے بہت بڑے عالم تذکرہ نگار، نقاد اور ادیب ہیں، وہ میرزا صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں "مظہر فیض الٰہی است و مشرق صبح آگاہی شاہ مسند فقر و فنا و مقیم آستان توکل و استغنا۔"[2]

میر تقی میران کا ذکر اس احترام و عقیدت سے کرتے ہیں "مردی است مقدس مظہر، درویش، عالم، صاحب کمال، شہرہ عالم، بے نظیر معزز، مکرم بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است، خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔"[3]

فتح علی گردیزی ان کے اخلاق و بلند منشی کی اس طرح مدح کرتے ہیں "بشرافت نسب و نبالت حسب موصوف است و بمکارم اخلاق و تعریف معروف، حقا کہ ذاتش مظہر تجلیات الٰہی است و منظر انوار فیوضات غیر متناہی، از بد و حیات..... از بلند منشی بہ توکل دائر و بسر بردہ و از والا ہمتی سر استغنا با دشاہ و وزیر فرو نا ختہ۔"[4]

قائم چاند پوری ان کے علم و عرفان کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں: "عالم و عامل، عارف و کامل، سر آمد ارباب تحقیق و پیش رو اہل تدقیق است، در ظاہر و باطن مرتبہ

---

[1] مخزن الغرائب، قلمی، [2] آزاد بلگرامی، سرو آزاد، ص ۲۳۱ [3] میر تقی میر نکات الشعرا ص ۵ [4] فتح علی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۱۳۱۔

رفیع وشان عظیم دارند[۱]؛

صاحب سفینۂ خوشگو ان الفاظ میں اظہار عقیدت کرتے ہیں،

"در آداب معاشرت حسن سلوک و مراتب فضل و شعر و بزرگی و قدر دانی یکتای روزگار بسیاری از اخوان الصفا دیدہ شدہ بخوبی ایں بزرگوار کم بہ نظر آمدہ ذات بابرکاتش را برص روزگار منت مزید است و در فہم حقائق و تصوف ثانی جنید و بایزید"،

قدرت اللہ شوق ان کے اوصاف اس طرح گنواتے ہیں،

"زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقۂ پیغمبر میرزا جان جاناں مظہر مردیست فرشتہ صفت،...... صاحب حال باکمال، خوش مقال، مرجع دستند عالم، معزز و مکرم، عالم متبحر...... در شاہجہاں آباد دہلی کہ منتخب ہفت اقلیم بود ہمچو او شخصی خوش قماش، نازک طبع برنخاستہ[۲]"

مصحفی کا بیان ہے کہ "از بادشاہ تا فقرا احدی نبود کہ آستان بوسیش را موجب افتخار خود ندانست[۳]"

طبقات سخن کے مصنف کے الفاظ میں وہ "شیخ کامل، مقتدای اہل زبان ہوشیار باطن، بیدار مغز، صاحب نسبت بودہ.... جہانی او را چشمۂ فیض حضر طریقت می پنداشت، فی الواقع آئینۂ حقیقت از تمثال بے مثالش جلا دید و بحر ناپید اکنار معرفت را بہ ضمیر صفای تصویر خود متوج بخشید... از اعاظم مستعدان دہر و اکابر عالی فطرتان عصر بودہ است[۴]"

---

[۱] قائم چاند پوری، مخزن نکات، ص ۲۴ [۲] قدرت اللہ شوق، طبقات الشعراء، قلمی، [۳] مصحفی عقد ثریا، ص ۵۵ [۴] طبقات سخن (مطبوعہ ہماری زبان، جلد ۱۹، شمارہ ۱۲) بحوالہ ابتلا رعشق میرٹھی، طبقات سخن، قلمی،

(۳)

تصانیف

میرزا مظہر کے سلسلۂ حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ وہ جوانی ہی میں تارک الدنیا ہو گئے تھے، اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ ذکر و مراقبہ میں گذرنے لگا تھا، مسلسل تیس سال تک مختلف بزرگوں سے کسب فیض کرنے کے بعد جب وہ مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھے تو ان کے وقت کا زیادہ حصہ مریدوں اور معتقدوں کی ہدایت و تربیت میں صرف ہونے لگا، ترویج طریقہ کی خاطر انھیں مختلف مقامات کا سفر بھی کرنا پڑتا تھا، شاید انھیں وجوہ کی بنا پر علم و فضل اور ذوق ادب کے باوجود انھوں نے کسی مستقل تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ کی اور نہ کر سکے، مگر چونکہ ذوق شعر گوئی انھیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، اس لئے اس جذبے کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان وہ بہر حال کرتے رہتے تھے،

میرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ میرزا مظہر "نظم و نثر ریختہ میں خوش بیان تھے"[۱] غالباً اسی بیان کی بنیاد پر گارساں دی تاسی نے بھی لکھ دیا کہ وہ نظم و نثر ریختہ میں

[۱] گلشن ہند، ص ۲۱۶

مہارت رکھتے تھے،[۱] لیکن میرزا صاحب کی کسی اردو نثر کی تصنیف کا ذکر کسی معاصر یا بعد کے تذکرے میں نہیں پایا جاتا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ صاحبِ گلشن ہند نے محض جوشِ عقیدت یا جوشِ بیان میں یہ جملہ لکھ دیا ہو اور گارساں دی تاسی نے اسی کو دہرا دیا،

میرزا مقصود وہبیدی کا بیان ہے کہ "ایشاں را اندر راہ طریقت تصانیف فائقہ بغایت خوب و مستحسن است"[۲] اسی طرح سے خلیل السہرندی نے بھی لکھا ہے کہ میرزا صاحب نے "چند رسائل مرغوب" تالیف کئے تھے، پھر آگے چل کر ان کی شہادت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے فضائل خلفائے راشدینؓ میں ایک رسالہ لکھا تھا،[۳] مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے بشارات مظہریہ میں میرزا صاحب کی دو[۴] تحریریں نقل کی ہیں،[۵] پہلی تحریر "حقیقت مذہب اہل سنت و بطلان رویہ شیعہ" میں تنبیہات خمسہ کے عنوان سے ہے، اور دوسری میں سلوک طریقہ کے مختلف مدارج بتائے گئے ہیں، مولوی نعیم اللہ نے دونوں تحریروں کو رسالہ کہا ہے، تصانیف فائقہ، چند رسائل مرغوب" اور "رسالہ در فضائل خلفای راشدین" سے غالباً مصنفین مزبور کی مراد یہی تحریریں ہیں، کیونکہ اور کسی ذریعے سے میرزا صاحب کی کسی تصنیف یا رسالے کا پتہ نہیں چلتا،

---

[۱] تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی) جلد دوم، ص ۲۹،

[۲] تراجم المشائخ الاحراریہ المجددیہ [۳] تراجم المشائخ المذکورین فی السلسلۃ المجددیہ [۵] یہ تحریریں مکاتیب میرزا مظہر (مرتبہ عبدالرزاق قریشی) میں ضمیمے کے طور پر شائع ہو چکی ہیں،

مرزا مظہرؒ کی جو تصانیف اس وقت پائی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) **دیوان مظہر**: یہ فارسی کا دیوان ہے، اس میں ۱۹۲۲ اشعار (غزل کے)، ۱۰ رباعیاں، ۲ مخمس، ۱ واسوخت، ۲ نہایت مختصر مثنویاں اور ایک قطعہ تاریخ ہے،

(۲) **خریطۂ جواہر**: اس میں فارسی کے مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب ہے، میرزا صاحب کے رقعات کا مجموعہ ہے،

(۳) **رقعات کرامت سعادت**: میرزا صاحب کے رقعات کا مجموعہ ہے،

(۴) **کلمات طیبات**: یہ بھی میرزا صاحب کے فارسی مکاتیب کا مجموعہ ہے، اس میں ۸۸ مکتوبات ہیں اور سب کے سب میرزا صاحب کے مریدوں اور معتقدوں کے نام ہیں، مکاتیب کے علاوہ اس میں میرزا صاحب کے بعض ملفوظات بھی ہیں،

(۵) **مکاتیب میرزا مظہر**: اس مجموعے میں ۲۴ خطوط ہیں اور چند کو چھوڑ کر سب کے سب قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے نام ہیں، یہ مکاتیب میرزا صاحب کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں اور زیادہ تر نجی باتوں پر مشتمل ہیں،

(۶) **اردو اشعار**: یہ اشعار مختلف تذکروں اور بیاضوں میں بکھرے پڑے ہیں، یہ اشعار اگرچہ کیفیت کے لحاظ سے بلند درجہ رکھتے ہیں، لیکن کمیت کے لحاظ سے بہت کم ہیں انھیں مختلف تذکروں اور بیاضوں سے یکجا اور مرتب کر کے کتاب کے آخری حصے میں شامل کر دیا گیا ہے،

آئندہ اوراق میں میرزا مظہرؒ کی انھیں تصانیف پر تفصیلی بحث کی جائے گی،

(۲)

نظم

(۱) فارسی کلام

گذشتہ اوراق میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ میرزا مظہر کے وقت کا زیادہ حصہ ذکر و مراقبہ اور مریدوں کی ہدایت و تربیت میں صرف ہوتا تھا، اور شعر گوئی کی طرف سے ان کی توجہ بہت کم ہو گئی تھی، انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کے تحفظ کا بھی انھیں کچھ زیادہ خیال نہ تھا، پھر بھی ان کے کلام کا کچھ حصہ سنہ ۱۱۵۰ھ میں ان کے ایک مرید کی کوشش سے جمع و ترتیب پایا تھا، اور اس پر خود میرزا صاحب نے دیباچہ لکھا تھا،[۱] یہی وہ مختصر دیوان ہے جس کا ذکر میر تقی میر نے نکات الشعراء میں کیا ہے،[۲] لیکن امتداد زمانہ اور بے سوادوں کی نقل در نقل کی وجہ سے اصل کلام میں بہت کچھ تغیر و تصرف ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے ایک نئے منتخب دیوان کی ترتیب کا ارادہ کیا موجودہ و مروجہ دیوان کے دیباچہ میں وہ خود کہتے ہیں کہ "ارباب نقل و روایات تصرفہای نمایاں کردہ نسخہ ہای غلط رواج دادند و کور سواداں چشمیکہ نداشتند از انصاف

---

[۱] میرزا مظہر، دیوان مظہر دیباچہ ط ص ۵،

پوشیدہ نقصان عاید بشان قائل کردند و بعض سخن نارسیدہ در پوست این ناتوان افتادند[۱]"

ان کے ایک حلقہ بگوش یا خود ان کے الفاظ میں "جوانی سراپا جانی" کا بھی اصرار تھا کہ وہ اپنے منتشر کلام کو تصحیح کے ساتھ دوبارہ مرتب کریں، اس لئے ۱۱۷۰ھ میں انھوں نے اپنے کلام کو از سرِنو اور مکمل طور پر مرتب کیا، تلاش و جستجو کے بعد "از سفینہ ہای بسیار" بیس[۲۰] ہزار اشعار جمع ہوئے، ان میں سے میرزا صاحب نے صرف ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا اور باقی کو قلمزد کر دیا اور دیباچہ لکھا کہ

"ہرچہ خارج ازیں جمع است طرح دانند مگر از واردات تازہ کہ بسیار کم اتفاق می افتد یا از مسودات کہن آنچہ میسر می آید و از نظر می گذرد درج نمودہ شود مسلم است[۲]"

یہ مختصر دیوان "بے ترتیب ردیف و اکثرش غزلش ناتمام" پر مشتمل ہے، اس میں صرف مندرجۂ ذیل ردیفوں میں غزلیں یا اشعار ہیں،

ا، ت، د، ر (صرف ایک غزل) ز، ع، (صرف ایک غزل) غ (دو شعر) ل (دو شعر)، م، ن، و (دو شعر)، ہ (صرف ایک غزل)، ی۔

غزلوں کے بعد دس[۱۰] رباعیاں، دو[۲] تضمینیں، ایک واسوخت، دو[۲] نہایت مختصر مثنویاں اور ایک قطعہ تاریخ ہے۔

دیوان مظہر پہلی بار ۱۲۷۱ھ میں مصطفائی پریس کانپور میں طبع ہوا، دیوان کے خاتمے پر صاحب مطبع نے "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے چند سطریں لکھی ہیں، اس کا آخری جملہ یہ ہے: "در مطبع مشہور نزدیک و دور یعنی مطبع مصطفائی واقع کانپور

---

[۱] میرزا مظہر، دیوان مظہر، دیباچہ [۲] ایضاً،

در شہر ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ روح افزای کالبد انطباع گردیدہ کحل الجواہر مشتاقان گردید"
صاحب مطبع نے اس کا حق طبع ۱۸۶۷ء کے قانون کی دفعہ ۲۰ کی رو سے محفوظ کرا لیا
تھا، اور لکھا تھا کہ کوئی صاحب ہماری اجازت کے بغیر طبع نہ فرمائیں۔

دیوان کے ضمیمے کے طور پر میرزا صاحب کا مشہور انتخاب خریطۂ جواہر بھی طبع ہوا ہے، اس کے اختتام پر صاحب مطبع نے جو عبارت لکھی ہے وہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس سے بدیہی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیوان مظہر اور خریطۂ جواہر مطبع مصطفائی میں پہلی بار چھپے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

"جناب شاں (یعنی میرزا مظہر جان جاناں اسکنہ اللہ فی فردوس الجنان) در ایام شباب از دواوین اساتذہ التقاط فرمودہ بودند بکمال طوع و رغبت علی الدوام نصب العین می داشتند نسخۂ مذکور اکثر ہا بخدمت شاہ غلام علی صاحب می بود استعارۃً بدست آوردہ فوز عظیم پنداشت و رقم مراد بر لوحۂ دل نگاشت، چوں اشاعت آں گوہر یکتا برای احتظاظ ارباب مذاق بمضمون

مصرع — کہ حلوا بہ تنہا نہ بایست خورد

مرکوز خاطر فاتر گردید۔ بعنایت الٰہی آں تمنا ہم آغوشِ حصول گشت و دیوان موصوف مع ضمیمۂ آں باہتمام احقر حلیۂ طبع پوشید۔"

میرزا مظہر نے اردو میں بھی اشعار کہے ہیں، یہ اشعار کمیت کے لحاظ سے اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن کیفیت کے لحاظ سے اہم ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں میرزا صاحب کا نام عزت سے لیا جاتا ہے، وہ اردو شاعری کے مصلح تھے، انھوں نے اردو کے معیار تغزل کو بلند کیا، انھیں کی کوشش سے "لچر سی زبان" نے تہذیب

وشایستگی پائی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرزا صاحب اصلاً فارسی کے شاعر تھے، کیفیت سے قطع نظران کے اشعار کی تعداد (بیس ہزار اشعار) بھی ان کے فارسی گو شاعر ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے،

میرزا صاحب کے فارسی کلام کی توصیف ان کے ہم عصروں نے بھی کی ہے اور بعد کے نقادوں نے بھی۔ مثلاً احمد علی سندیلوی کی رائے ہے کہ "ازبسکہ کانون سینۂ بے کینہ اش پر از عشق بود بیشتر اشعار عاشقانۂ پر درد از قلمش می ریخت"[۱]۔

غلام علی آزاد بلگرامی اس شاعرانہ انداز میں مدح سرائی کرتے ہیں، "باقتضای اسم خود روح الروح معنی پروری، نوعروس مقال را بشائستگی ذہنش طرز تازہ و تصویر خیال را بتردستی فکرش حسن بے اندازہ، شعلۂ اندازش آتش زن خرمنہا و شوخی اندازش شور افگن انجمنہا"[۲]۔

قدرت اللہ شوق کہتے ہیں کہ "سخنوری بود نازک خیال، خوش مقال"[۳]۔

میر اشرف علی خاں کا بیان ہے کہ "در عالم او ابدی مثل ایشاں کم کسے گفتہ... در اشعار ایشاں طور خاصی است، جمیع اشعار حال و عاشقانۂ دردمندانہ گفتہ اند"[۴]۔

افضل بیگ قاقشال اس طرح داد سخن دیتے ہیں: "در فکر اشعار فارسی..... عدیم المثال و کلامش ہمہ پر از درد و حال است"[۵]۔

قیام الدین حیرت اکبرآبادی ان کی سخن گوئی و سخن سنجی کی اس طرح مدح کرتے ہیں، "آں کس کہ امروز در قلمرو سخن دانی کوس خلافتش بلند آوازگی دارد اوست و

---

[۱] احمد علی سندیلوی: مخزن الغرائب قلمی [۲] آزاد بلگرامی، سرو آزاد ص ۳۲۳ [۳] قدرت اللہ شوق، تکملۃ الشعراء (قلمی)، [۴] میر اشرف علی خاں تذکرۃ الشعراء (قلمی)، [۵] افضل بیگ قاقشاں: تحفۃ الشعراء (قلمی)

آں کہ دریں ایام در خطۂ شاعری بر نقد سخن سکۂ موزونی بنامش نوی و تازگی دارد و، بنیاد نزاکت معانی و ادا بندی در شہر سخن سنجی ریختۂ معمار فکر تش[1]"

حمید اورنگ آبادی کا بیان ہے کہ "اشعار فارسی و ہندی او از بلاد ہندوستان تا دکن زبان زد عالم اظہر من الشمس است[2]"

فتح علی گردیزی کہتے ہیں کہ "شعر فارسیش بغایت لطافت دارد[3]"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی رائے ہے، "بعض خیالات بغایت پسندیدہ و مطلوب و مقبول دارد[4]"

نیاز فتح پوری ہماری زبان کے مشہور ادیب و نقاد تھے، ان کی فارسی دانی مستند اور ان کا تنقیدی شعور مسلم تھا، ان کی رائے میں ہندوستان نے پانچ ایسے شاعر پیدا کیے جنھیں ایران کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے، وہ پانچ شاعر یہ ہیں:

(۱) امیر خسروؒ (۲) ابوالفیض فیضی (۳) میرزا عبد القادر بیدل (۴) میرزا مظہرؒ (۵) میرزا غالب[5]

میرزا مظہرؒ کے کلام کے متعلق نیاز کی رائے یہ ہے کہ "ان کی غزل گوئی میں سعدی و مابعد سعدی دونوں زمانوں کا رنگ سمویا ہوا ہے[6]"

ہر بڑے شاعر کی طرح میرزا صاحب کو خود بھی اپنے کلام کی عظمت کا احساس تھا، چنانچہ بعض اشعار میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً

---

[1] مقالات الشعرا (قلمی)، [2] گلشن گفتار، ص ۲۳ [3] تذکرہ ریختہ گویان، ص ۱۳۱ [4] گلشن بے خار، ص ۲۶۶ [5] انتقادیات جلد دوم، ص ۲۰۹ [6] ایضاً،

کنوں ز طبع بلند خودم یقیں گردید — کہ بر زمین سخن نیز آسمانی ہست

تواند نالہ کردن با چنیں خوبی و موزونی — چو مظہر ہر کہ با دیوانگیہا میرزا باشد

سر فرو با کس نمی آریم در طرز سخن — خوش ادائیہای مظہر میرزا را بندہ ایم

حاجتم نیست بہ تعریف عزیزاں مظہر — کہ سخن می کند اظہار سخن دانی من

بحرف کس نماند حرف من مظہر چو جبریلم — خدا بے واسطہ تعلیم و اصلاح سخن کردہ

میرزا صاحب کے مرید رشید مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جسے یہاں نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ معمولات مظہریہ میں لکھتے ہیں کہ

"ایک دن اہل خانقاہ میں سے ایک شخص نے حاجی محمد افضل سے جو میرزا صاحب کے شیخ الحدیث تھے، عرض کیا کہ حضرت میرزا صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ شعر پڑھتے ہیں تو اس کا اثر دل پر ہوتا ہے.... اور دل کو اس سے بڑا حظ حاصل ہوتا ہے، اس کے برعکس دوسرے عزیزوں کے کلام میں وہ لذت نہیں پائی جاتی، اس کا سبب کیا ہے؟ حاجی صاحب نے فرمایا کہ وہ (میرزا مظہر) مردان خدا اور اہل درد میں سے ہیں، جو کچھ پڑھتے ہیں درد دل سے پڑھتے ہیں اس لئے سننے والوں پر اس کا اثر ہوتا ہے"[1]

غزل کا محور عشق و محبت ہے اور اس معاملے میں طبعی و جذباتی حیثیت سے ایران اور ایرانیوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اسی وجہ سے یہ ملک اور اس کی شاعری بڑی حد تک مجازی و حقیقی عشق کا محور و مرکز رہی ہے، لیکن غزل کی ترقی حقیقت میں تصوف کی ممنون احسان ہے، تصوف کا تعلق بھی واردات قلبی اور کیفیات عشق سے

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، معمولات مظہریہ، ص ۱۳۰

ہے، فرق یہ ہے کہ صوفی کا عشق عشق حقیقی ہے اور اس کے کلام میں مے و مینا اور بادہ و جام محض ایک پردہ ہے، بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ غزل میں توانائی و رعنائی تصوف کے اثر سے پیدا ہوئی، اس اجمال کی تفصیل فارسی شاعری کے عظیم نقاد مولانا شبلی کی زبان میں یہ ہے

" اس کشش یعنی عشق کا مبدا حسن ہے، یعنی حسن جہاں ..... جائے گا یہ کشش بھی ہوگی، اور جس قدر حسن کامل تر ہوگا اسی قدر کشش بھی زیادہ قوی اور سخت ہوگی اور چونکہ حسن کامل صرف شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے، اس لئے عشق بھی وہی کامل ہوگا جو شاہد حقیقی سے تعلق رکھتا ہو، یہی وجہ ہے کہ حضرات صوفیہ کی شاعری میں جو جذبہ اور اثر ہے اوروں کے کلام میں اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، حضرات صوفیہ کا مطلوب چونکہ شاہد حقیقی ہے اس لئے ان کا عشق ہوا و ہوس سے پاک اور نہایت قوی اور مستقل ہوتا ہے، مجازی حسن ناکامل اور سریع الزوال ہے، اس لئے عشق مجازی میں وہ زور وہ جذبہ، وہ استقلال نہیں ہو سکتا جو عشق حقیقی کا خاصہ ہے،

....

عشق میں سیکڑوں قسم کی وارداتیں پیش آتی ہیں، محویت، شوق، جانبازی، شکایت، انتظار، وصل، ہجر، یہ تمام واردات اور جذبات عام شاعری کے موضوع ہیں، لیکن یہی جذبات جب تصوف کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو ان میں نہایت زور اور جوش پیدا ہو جاتا ہے،

....

اس موقع پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ عشق مجازی میں جو وارداتیں پیش آتی ہیں،

عشق حقیقی میں ان کا کیا موقع ہے، شاہدِ حقیقی (یعنی ذات باری) زمان و مکان، صورت و شکل، سمت اور جہت سے مطلق بری ہے، دیدار، وصال، فراق، انتظار، شوق، محویت، جذبات کا کیا محل ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عارف پر ذاتی اور صفاتی تجلیات اور مشاہدات میں جو کیفیات گذرتی ہیں وہ عشق مجازی کی واردات سے بالکل ملتی جلتی ہیں، اس لئے اس قسم کے لیکن زیادہ لطیف، زیادہ پرجوش اور زیادہ پاک جذبات پیدا ہوتے ہیں اور صوفی شعرا انھیں کو عام الفاظ میں ادا کرتے ہیں[1]۔

میرزا مظہر بادۂ تصوف کے لذت آشنا تھے اس لئے عشق کی کیفیات اور حسن کی اداؤں کو خوب سمجھتے تھے، حسن کی ہر ادا ان کے لئے زندگی کا ایک نیا پیام تھی اور عشق کا ہر جرعہ ان کے لئے لذت و کیف کا باعث تھا، حسن کی پرستش کی وجہ سے ان کے یہاں جذبۂ فدائیت ہے، ان کے نزدیک عاشقی فن شریف ہے، عشق کی بدولت وہ اپنے اشک خون آلود کو ہر قطرے کو گلبرگ سے زیادہ رنگین پاتے ہیں، ان کی آہ درد اندود دنیا کا بہترین نغمہ بلکہ مقصود عاشقی ہے، وہ اپنے آپ کو خلیل عشق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اس لئے ہر غم ان کا مہمان ہوتا ہے، ان کے یہاں وصل کی تمنا اور ہجر کی بیقراری ضرور ہے لیکن محرومی و مایوسی نہیں، تڑپ اور فریاد ہے مگر نالۂ وشیون اور صدائے ماتم نہیں، ان کی فغاں، فغان خاموش ہے، ہمسایہ کی نیند حرام کر دینے والی نہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں محبوب کا احترام ہے، پاس ادب انھیں محبوب کے چہرے پر بھی نظر نہیں ڈالنے دیتا، وہ محبوب کی بے رخی اور دوسرے آزمائشی طریقوں پر نالہ و فریاد نہیں

---

[1] شعرالعجم، جلد پنجم، ص ۸۴ تا ۸۷،

کرتے بلکہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح انھیں اپنی وفا کا ثبوت بہم پہنچانے کا موقع ملتا ہے، وہ زخم دل بھر جانے کی تمنا نہیں کرتے، بلکہ اسے ہرا رکھنے کی خواہش ان کے سینہ میں کروٹیں لیتی ہے، کیونکہ یہ یادگار ناوک مژگان دوست ہے، محبوب کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کا دست فریاد دست دعا میں تبدیل ہو جاتا ہے، مختصر یہ کہ ان کا کلام کیفیات عشق میں ڈوبا ہوا ہے اور یہی ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے، اس خصوصیت نے ان کے کلام میں شیرینی و تازگی اور رعنائی و برنائی پیدا کر دی ہے، خود میرزا صاحب کو بھی اس کا احساس تھا، ایک مقطع میں فرماتے ہیں،

چو برگ گل زبان را در شکر گیرد بیان ما حلاوت می چکد از گفتگوی عشق ما مظہر

ذیل کے اشعار میں مختلف کیفیات عشق کی کامیاب مصوری پائی جاتی ہے:

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

لذت صد زندگی در نیم کشتن می دہد تیر مژگان بتان پیکان زہر آلودنیست

چہ خوش بروی دل تنگ ما دری وا کرد خدا دراز کند عمر زخم کاری ما

نام اگر مظہر بر آورد م بشاہی فخر نیست کاش خواندی بندۂ خود مرد آزادی مرا

ہزار عمر فدای وی کہ من از شوق بخاک و خون طپم و گوئی از برای نیست

کیست امروز بجز مظہر دیوانۂ ما آنکہ ہر شب بہ تمنای تو صد بار گریست

زخم دل مظہر بہ پاداب شود ہشیار باش کیں جراحت یادگار ناوک مژگان اوست

باز شاید شدہ ای عاشق گل پیرہنی مظہر ایں چاک گریباں تو بے چیزی نیست

ہیچ گلبرگی برنگ اشک خون آلودنیست ہیچ آہنگی بذوق آہ درد اندود نیست

چشم ہرگاہ کہ بر روی تو وا می گردد دست فریاد مرا دست دعا می گردد

خدا از تہمت راحت پرستیہا نگہ دارد   خوشا مردی کہ در دیار طبعش را دوا باشد

اگرچہ طاقت، یک گردش نگاہم نیست   خدا نکند ہمہ نازش بجانِ من باشد

آں کشتۂ بیخ حق محبت ادا نہ کرد   کز بہر دست و بازوی قاتل دعا نہ کرد

دین ما دیدن و ہیہات کہ دیدن مشکل   نہ رسیدن بہ بتاں کفر و رسیدن مشکل

از برای سجدۂ عشق آستانے یافتم   سر زمینی بود منظور آسمانی یافتم

تصوف کے مختلف اہم مقامات میں سے ایک مقام رضا ہے، رضا کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے سب خدا ہی کے حکم سے ہوتا ہے، اس لئے انسان کو شکایت کرنے یا رنجیدہ ہونے کا حق نہیں، اسی بنا پر صوفی عاشق محبوب کی بے رخی و کج ادائی پر بھی خوشی محسوس کرتا ہے، اس کے ظلم و ستم میں اسے لطف و کرم کا مزہ ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ محبوب کے آزار و ستم کا منتظر رہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مقامِ رضا میں پہنچکر صوفی کو وہ لذت ملنے لگتی ہے کہ وہ جور و ستم کی آرزو کرنے لگتا ہے، میرزا صاحب کے کلام میں بہت سے ایسے اشعار ملیں گے جو جذبۂ رضا کی نمایندگی کرتے ہیں، مثلاً

بکامم تلخ گرداند خدا شیرینیٔ غم را   فروغم گر زبید ردی بشادی ذوقِ ماتم را

مرگ آرزو کنم چو شوی مہربان من   یعنی دگر بہ بخت خودم اعتبار نیست

خدا نکردہ برہمن ز بت کند فریاد   تو واقفی کہ چہ از نالہ مدعای منست

بہر کجا کہ غمی ہست میہمان منست   خلیل عشقی و لخت جگر بخوانِ منست

سرم بہ حضرت عیسیٰ چرا فرود آید   برای جان من این دردِ دل دوای خوشست

منم کہ شکر جفا از و زیادہ گستم   اگر ستم نہ کنی بر چنیں کسے ستم است

بیداد بتاں را ستم و جور ندانند   ایں سوختن و کشتن و بستن ہمہ ناز است

رحم بر حالِ دلم کردی و من داغ شدم | کایں دلی بود کہ شائستۂ آزار تو بود
سایۂ جور و جفا از فرقِ مظہر برمگیر | ابر تیغ ایں خاک را شاداب و خرم میکند
مکن در عاشقی تعلیم خودداری مرا ناصح | ز خوباں سرکشی و ز میرزا مظہر جبیں سائی

ان تمام اشعار میں جو اب تک پیش کئے گئے ہیں داخلی واردات و کیفیات کی عکاسی پائی جاتی ہے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، میرزا صاحب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے، لیکن ان کا کلام خارجی کیفیات کی مصوری سے بھی خالی نہیں، ان کے یہاں اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں:

باشد بوصفِ لعلِ لبِ دلستانِ ما | مانندِ غنچہ پُر ز زبانہا دہانِ ما
غنچہ ساں مظہر زخون دل دہن پر می شود | یاد می آید چو آں لبہای عنابی مرا
فتادہ او نزاکت ز بسکہ رنگِ ترا | تن تو ساخت گلابی قبای تنگ ترا
فریاد ازیں کہ چوں مہِ محرم | بے زر نتواں دید رخِ سیم تنی را
کرد رنگیں تر خطِ سبزِ تو رخسارِ ترا | گلشن تصویر را موباغبانی می کند
از رخ پرعرقت گریہ بشور آمدہ است | آب بر آب چو افتد بفغاں می آید
می تواں داد بخدمتِ خیالی خویش | کہ ببالای تو عمریست نظر دوختہ ایم

تخیل شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے، اسلوب بیان اور طرز ادا پر فریفتہ ہونے والے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے، کسی زبان کا شعری سرمایہ محض اسلوب بیان کی وجہ سے زندہ نہیں رہ سکتا، تخیل اور اسلوب بیان دونوں مل کر اسے دوام بخشتے ہیں لیکن تخیل کے پردے میں خیالات کے طوطا مینا بنا کر اڑانے سے شعر کی لطافت جاتی رہتی ہے، ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں میرزا عبدالقادر بیدل

عظیم آبادی کا پیچیدہ تخئیل کے لئے مشہور ہیں، ان کی تخئیل اس قدر پیچیدہ اور استعارے اتنے دور دراز کار ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا الجھن میں پڑ جاتا ہے، میرزا مظہر نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو بیدل کو سارے ہندوستان پر چھایا ہوا پایا، لیکن انھوں نے اپنی سنجیدہ افتادِ طبع کی وجہ سے اس رنگ کے قبول کرنے سے احتراز کیا، ان کے یہاں پیچیدہ تخئیل اور دور دراز کار استعارے نہیں ملیں گے، لیکن ان کا کلام لطافتِ خیال سے خالی نہیں، مثلاً چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

قضا از مشہد ماشت خونی دام می گیرد
کہ تا رنگیں کند ہنگامۂ روز قیامت را

بے کسی مشہور کرد آخر بیکتائی مرا
داد تشریف خدائی فیض تنہائی مرا

علو رتبہ ام در عالم بے دستگی بنگر
کہ دستم را ز عار از پا فتادن ہم نمی گیرد

شب نمودند بمن نامۂ اعمال مرا
صبح دیدم کہ بدستم سر گیسوی تو بود

ازاں پیراہن خود چاک می سازم کہ می ترسم
گریبانم بہ محشر آید و دامان من گیرد

حرفی نہ ساخت نامہ برم از زبان یار
شرمش نیامد از دل امیدوار من

داغم ز تنگ فرصتی دل کہ چوں سپند
عمرش برای نالۂ دیگر وفا نہ کرد

اوپر کہا جا چکا ہے کہ غزل کی ترقی تصوف کی ممنونِ احسان ہے، اول اول متصوفانہ مضامین صاحب حال صوفیہ غزل میں داخل کئے اور انھوں نے تیر و نشتر کا کام کیا، لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک رسمی چیز بن گئی اور ہر چھوٹے بڑے غزل گو شاعر کے یہاں چند اشعار ایسے مل جاتے ہیں جن میں متصوفانہ مضامین استعمال ہوئے ہیں، مگر میرزا مظہر چونکہ صاحب حال صوفی تھے اس لئے ان کے یہاں متصوفانہ مضامین محض رسمی طور پر استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کے دلِ گداختہ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں،

یہ اشعار تصوف کے بعض مسائل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، مثلاً وحدت شہود، جبر و قدر فنا، وسعت مشرب وغیرہ۔

مہر و مہ، ارض و سما آئینہ شکل اند ہمہ — می تواں یافت کہ در پردہ خود آرائی ہست

کثرت ایں نقشہا عرض تجلیہای اوست — در دو عالم غیر یک نقاش کس موجود نیست

رستن از قید خودی مظہر بحق پیوستن است — قطرہ بودم بحر یک گشتم تماشا کردہ است

مظہر طلبی گر بجہاں منزل راحت — بگذر ز تو خود در پس ایں پردہ مقام است

از ہمہ قطع نظر کن تا بہ بینی روی دوست — چشم بستن از جہاں چشم دگر وا می کند

ای جنوں با جیب من شوخی مکن ہشیار باش — کیں گریباں سایہ پرور زدہ داماں اوست

آہ مظہر، تو کجائی کہ بی جستن تو — مہ جدا، مہر جدا، چرخ جدا می گردد

وسعت مشرب چہ دنیای فراخی بودہ است — چوں فلک در گردش ساغر جہانی یافتم

می روم اما عناں من بدست خویش نیست — ہمچو کشتی ساخت سیل گریہ دریائی مرا

چناں از خویش می رفتم کہ ہرگز بر نمی گشتم — اگر می بود در دستم عنان اختیار من

مندرجۂ ذیل اشعار میں حیاتِ انسانی کی ناپائیداری اور دنیا کی بے ثباتی کا اظہار کیا گیا ہے:

مبادا بلبل دیگر پس من آشیاں بندد — تواں آویخت بر شاخ بلندی استخوانم را

یارب چہ فتاد بلبلاں را — در باغ نشان آشیاں نیست

عمر باشد خوش بکنج نیستی آسودہ است — میرزا مظہر حریف بزم ہست و بود نیست

مظہر خوش گوی ماز آغاز و انجامش مپرس — گشت از خواب عدم بیدار و باز افسانہ شد

بلبل بکجا رود چہ کند کاندریں چمن — نشگفت غنچہ ای کہ بہ گلچیں خبر نشد

بکنج باغ زبید از ظالمانے چند   فتادہ اند بری چند و آشنائے چند

میرزا مظہر کے کلام میں متانت و سنجیدگی ہے، لیکن ان کی متانت بوجھل نہیں بلکہ لطیف و جمیل ہے، میرزا صاحب کی زندگی میں بھی متانت کے ساتھ لطافت تھی، ان کے یہاں تقدس تھا تقشف نہیں تھا، زہد تھا خشکی نہیں تھی، اسی لئے ان کے کلام میں نغمہ، سرود اور جوش و سرمستی کی لہریں بھی پائی جاتی ہیں، ان کے اس قسم کے اشعار حافظ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہی رندی و سرمستی کا عالم ہے جس کے لئے حافظ کا کلام ممتاز ہے، وہی سبزہ و بہار سے لطف اٹھانے کی کیفیت ہے جس کا اظہار حافظ کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے، یوں تو میرزا صاحب کے سارے کلام میں خمارِ چشم ساقی کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن اس رنگ کے اشعار میں یہ اثر شدید تر ہو جاتا ہے، مثالاً چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ساقی بدہ آں مے کہ زمستی نشناسم   پیمانہ کدام و لب جانانہ کدام است

جوش زمستی زچشم دلبراں میخانہ شد   مشت خاک می پرستاں چرخ زد پیمانہ شد

نگاہِ مست تو آں را کہ مستفید کند   ہزار پیر خرابات را مرید کند

شور باراں برنمی تابد سر مخمور من   پنبہ بردار از سر مینا و در گوشم گذار

بے حمایت نبود می کشئ ما زاہد   سایۂ دستِ خدا ابر بود بر سر ما

مہتاب و شراب و انتظارت   ایں روز قیامت شب نیست

سرت گردم چو نرگس در خیال چشم مخمورت   بجای اشک ہر مژگان من ساغر بروں آوردہ است

زیکسو بوی گل و زیکطرف پیغام یار آمد   من آں دیوانہ ام کز ہر دو سوی من بہار آمد

نو بہار آمد مرا زنجیر در گلشن کنید   دوستاں امسال تدبیرم بطور من کنید

دشت را باد بہاری اشک صد میخانہ ساخت   ہر طرف رعنا غزالی مست خواب افتادہ است

ان اشعار میں ابر و باد، سبزہ و باراں، جام و مینا اور خمار چشم ساقی کے اثر سے جوش و مستی پیدا ہوئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرزا صاحب کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت جوش بیان بھی ہے، ان کے کلام کی بنیاد واردات عشق، بیان شوق اور سوز و گداز پر ہے مگر چونکہ وہ فطرۃً زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے، اس لئے ان کے یہاں بجائے نوحۂ غم کے جوش انبساط ہے، جیسا کہ اوپر کہا گیا وہ درد و الم کو مقصود عاشقی سمجھتے ہیں، اس لئے صدائے ماتم بلند نہیں کرتے، وہ اپنے دل کو شایستۂ آزار سمجھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جذبۂ بے اختیار شوق کا اظہار بڑے جوش و مسرت کے ساتھ کرتے ہیں، جوش بیان کے لئے کسی خاص موضوع کی قید نہیں ہر قسم کا خیال جوش کے ساتھ ظاہر کیا جا سکتا ہے، لیکن میرزا صاحب کے کلام کی بنیاد چونکہ واردات عشق پر ہے اس لئے یہاں مثالاً صرف ایسے ہی اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں واردات حسن و عشق کا اظہار پایا جاتا ہے،

ز عشق او بداغی کی تسلی می شوم مظہر
کہ غرق سوختن چوں شعلہ می خواہم سراپا را

در چشم من کہ بے تو دلم را قرار نیست
آتش بلند گشتہ ز گلشن بہار نیست

حسن ادب نگر کہ بعشقت بریختم
اشکی کہ رشک صد گہر آبدار نیست

ہیچ گلبرگی برنگ اشک خوں آلود نیست
ہیچ آہنگی بذوق آہ درد اندود نیست

سیل خوں از سینۂ گرم رواں کردہ است عشق
نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

شام من پروردہ در آغوش صبح فتنہ زا
روز محشر قرۃ العین شب تار نیست

ز صد جا چاک سازد جامہ را انداز حسن او
چوں آں صہبای پر زوری کہ در مینا نمی گنجد

دماغ عشق نازک تر ز حسن است
ترا رنگ و مرا بو آفریدند

از برای سجدۂ عشق آستانے یافتم | سرزمینی بود منظور آسمانے یافتم
گر ستن نیز طرز عرض احوالست می گریم | فغاں ہم طوری از اطوار گفتار است می نالم

حسن کلام کا ایک بڑا معیار اس کی تاثیر ہے، دوسرے لفظوں میں اسی بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ کلام میں سوز و گداز ہونا چاہیئے، میرزا مظہر چوں کہ پہلو میں دل گداختہ رکھتے تھے، اس لئے ان کے اشعار سوز و گداز سے خالی نہیں، لیکن ان کے سوز میں مرثیہ خوانی نہیں، سوز و گداز اور آہ و بکا دو مختلف چیزیں ہیں، عاشق کی فغاں عام آدمی کی صدائے ماتم سے مختلف ہوتی ہے، سوز و گداز حقیقت میں دل کی لطیف دردمندانہ کیفیت کے اظہار کو کہتے ہیں، میرزا صاحب کا دل کیفیات عشق سے لبریز تھا، اس لئے ان کے اشعار میں حسن کی تمکنت اور محبت کی رنگینی کے ساتھ ساتھ عشق کی تڑپ بھی پائی جاتی ہے:

نہ باگل واشدم گاہی نہ گرد شمع گردیدم | چہ واقع شد کہ آزردی ز من آزردہ جانی را
آں بلبلم کہ چوں بچمن فصل گل رسد | ریزد چو برگہای خزاں بال و پر مرا
چشم من بسکہ ز محرومی دیدار گریست | گریہ از رحم بریں دیدۂ خوں بار گریست
جای رحمت ای ہجوم آہ و ای سیلاب اشک | یادگار از من ہمیں مشت غباری ماندہ است
شد پریشاں مجمع احباب و مدتہا گذشت | ظاہر از آں فرقہ مظہر نام یاری ماندہ است
منم آں بلبل بے بال و پر کز نا امیدیہا | ندارم خوش کہ از گل بر سم و حرف از چمن گویم
بے کسی را چہ بمعراج رساندی مظہر | جز غم یار کسی مونس و غم خوار تو نیست

شاعری کی ایک اہم صفت تمثیل ہے، جس نے صنف کا درجہ حاصل کر لیا ہے، تمثیلی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ شاعر ایک دعوا کرتا ہے اور پھر اس دعوے کی دلیل

پیش کرتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ یہ دلیل منطقی یا عقلی حیثیت سے بھی صحیح ہو، تمثیل حقیقت میں ایک مرکب تشبیہ ہے، مفرد تشبیہ کے ساتھ ساتھ شعرا نے مرکب تشبیہیں بھی بنائی ہیں، آگے چل کر انھیں مرکب تشبیہوں نے تخئیل کا درجہ حاصل کیا، تمثیلی شاعری کا میدان مفرد تشبیہ سے زیادہ وسیع ہے اور اس کا اثر بھی نسبتہً زیادہ ہوتا ہے فارسی میں اس رنگ شاعری میں کلیم، صائب، غنی کاشمیری وغیرہ بہت ممتاز ہیں، میرزا صاحب کے یہاں بھی اس رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں، اور توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں، ان کی تمثیلیں دور از کار نہیں اور نہ ان کے یہ اشعار شعریت سے خالی ہیں،

عیب بیناں واقف از نقصان خویشم کردہ اند	ہمچو عینک ساخت چشم دیگراں بینا مرا
بود محبت ناداں بلا کہ یوسف را	طرب سرای زلیخا تمام زندانست
ارباب صفا دوست ز دشمن نہ شناسند	بر روی بد و نیک در آئینہ باز است
درویش را ز دولت دنیا نصیب نیست	ہرگز شکر بکام نی بوریا نشد
بے طلب چیزیکہ می باید بہر کس می دہند	از عدم نرگس عصا با چشم کور آوردہ است
سینہ ام کسب صفا از خاکساری میکند	از غبار آئینہ عشق بی غباری می کند
بر اہل استقامت فیض نازل میشود مظہر	نمی دانی تجلی گرد کوہ طور می گردد

تمثیلی اشعار سے عموماً اخلاقی تعلیم و تلقین کا کام لیا گیا ہے، چنانچہ میرزا صاحب کے ان اشعار میں بھی اخلاقی تلقین پائی جاتی ہے، لیکن فارسی میں اس رنگ کے عشقیہ اشعار کی بھی کمی نہیں، میرزا صاحب کے یہاں بھی تمثیلی رنگ میں عشقیہ اشعار ملتے ہیں، مثلاً

دلبراں ہم نالہ دارند اما نازک است	بانگ گل این نکتہ می گوید بسر گوشی مرا

دلم بردی تو این دیدۂ پر آب گزاشت — کہ رخت ترشدہ باید بآفتاب گذاشت

کارگاہ حسن را از فیض مژگانم صفات — خانۂ تصویر را جز موقلم جاروب نیست

دشمن و دست شدن لازم حسن افتادست — شمع خواہد کہ ز پروانہ برنمی نگذارد

باین ضعف از اشارتہای ابروی تو در شورم — کہ تا سازندہ را ناخن بجنبد تار می نالد

عشق را گر رخصت شوخی نمی بودی ز حسن — دست کی کردی زلیخا سوی پیراہن دراز

میرزا صاحب کی شاعری عشقیہ شاعری ہے لیکن ان کے یہاں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار ملتے ہیں، ان کی زندگی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں استغنا و بے نیازی بہت تھی، ان کے ان اشعار میں اسی فلسفۂ اخلاق کی جھلک نظر آتی ہے،

زندگی بے منت ار آید میسر باک نیست — ہمتش نازم کہ ممنونِ مسیحا می شود

ز شرم آنکہ پیش تشنہ کاماں تر شود — بلب جانش گر آید نام جام جم نمی گیرد

اگر مظہر باین ہمت ز خضر آب بقا خواہد — ز ننگ زندگانی تا دم مردن خجل باشد

انفعال جرم بہتر از غرور طاعت است — مظہر ای دور از حقیقت بر نماز خود مناز

شدم عزیز چمن مظہر از سبک روحی — چو بوی گل دل ہر غنچہ آشیاں نیست

ما و الی قلمرو سیر و سیاحتیم — ہر نفس پای خویش بود پای تخت ما

میرزا صاحب کے کلام کی بنیاد چونکہ وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ عشق پر ہے، اس لئے اس میں رنگینی آگئی ہے، اس رنگینی کو ان کے شگفتہ اسلوب بیان نے دلکش تر بنا دیا ہے، ان کے یہاں متانت کے باوجود لطافت و خوشگواری پائی جاتی ہے، اسلوب بیان کی یہی خوشگواری موسیقی ہے، ناقدین شعر نے موسیقی کو شاعری کا ایک اہم جزو قرار دیا ہے، اس لئے ہر اچھے شاعر کے کلام میں موسیقی یا خوش نوائی ضرور ہوگی،

میرزا صاحب کا کلام بھی اس وصف سے خالی نہیں، ان کے کلام میں، خوش نوائی کہیں مترنم بحروں کے انتخاب سے پیدا ہوتی ہے اور کہیں مترنم الفاظ کی مدد سے۔ کبھی مناسب الفاظ خوش آہنگی کا سبب بنتے ہیں اور کبھی تکرار الفاظ۔ لیکن اکثر و بیشتر وہ ہم آواز حرفوں کے الفاظ کی مدد سے خوش آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار خوش نوائی کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں،

قضا از شہد ما مشت خونی دام می گیرد ۔۔۔ کہ تا رنگیں کند ہنگامۂ روز قیامت را
شام من پرورده در آغوش صبح فتنہ زا ۔۔۔ روز محشر قرۃ العین شب تار من است
جوش زد مستی ز چشم دلبراں میخانہ شد ۔۔۔ مشت خاکی نی پرستاں چرخ زد پیمانہ شد
جست از داغی شراری چند انجم نقش است ۔۔۔ گرد ما دودی ز دل چرخ وفا بیگانہ شد
بساط خرمی ہر گاہ بچشمم چید می گرید ۔۔۔ چو شبنم روی گل رنگی بہر جا دیدمی گرید
بچہ ناز گرد بادی ز غبار ما بپاید ۔۔۔ اگر آں دراز دامن بمزار ما بیاید
چشم بر چشم تو افتاد گرفتاریہا ست ۔۔۔ حلقہ بر حلقہ چو افزود دگر زنجیر است
بی نوائی گل، گل چو بلبل زیر خار افتادہ است ۔۔۔ باغ بی روی تو از چشم بہار افتادہ است
بہار آخر شد و گل، وانشد با من زہی قسمت ۔۔۔ نرفت امسال ہم از سینہ بیروں خار خار من

میرزا صاحب ایک مقطع میں فرماتے ہیں،

بی سند مظہر نباشد ہیچ فن را اعتبار ۔۔۔ نالہ موزوں کردنم از بلبل آمل رسید

بلبل آمل (طالب آملی) کا کلام ندرت تشبیہ اور لطف استعارہ کے لئے ممتاز ہے، اور میرزا مظہر کے کلام کی نمایاں خصوصیت جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا کیفیات عشق کی مصوری اور واردات قلبی کا اظہار ہے۔ اس لئے دونوں کے کلام میں کوئی مماثلت

نہیں اور مقطع میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اسے شاعرانہ دعوے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی پھر بھی میرزا صاحب کا کلام نادر تشبیہوں اور لطیف استعاروں سے خالی نہیں۔ مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار پڑھیے،

نوبہار عمر رفت و جسم زاری ماندہ است | باغ ویراں شد نشانش مشت خاری ماندہ است

بر بہار رفتۂ عمر خودم جاریست اشک | یادگار آں گلستاں آبشاری ماندہ است

داغ دل گر آفتاب آسمان آتش است | اشک گرم ما چراغ دودمانِ آتش است

جست از داغی شراری چند انجم نقش بست | گرد درم دودی ز دل چرخ وفا بیگانہ شد

یاد ایامیکہ در شور جنوں تاثیر بود | آفتابے چوں سحر مارا گریباں گیر بود

یار از گریۂ شبہای غم می پرسید | ناگہاں ابر سیاہی ز مقابل برخاست

اشک طوفانیٔ من چشم مرا کرد سفید | آں قدر جوش زد ایں بحر کہ کف کرد آخر

تشبیہ اور استعارہ کے علاوہ میرزا صاحب کے کلام میں بعض دوسری صنعتیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً مراعات النظیر، صنعت طباق وغیرہ، مراعات النظیر کی چند مثالیں،

بلبلم لیک ہوادار گل داغ توام | ہمچو مرغان قفس کار بہ گلزارم نیست

بلبل کجا رود چہ کند کاندریں چمن | نشگفت غنچہ ای کہ بہ گلچیں خبر نشد

نخوری فریب صافی کہ شیشہ ہاست ای دل | نہ ہماں خم ست دردی کہ تو در سفال داری

پسند خاطر مردانہ نادر و آشاماں | می مینا شکن با دلبر پیماں گسل باشد

باد تند ابر مطیرست از برای شعلہ زار | نالۂ ما آبیار گلستان آتش است

ضبط اشک و آہ از ما و گرفتاراں مخواہ | آتش ایں خام سوزاں بی شرار و دود نیست

صنعت طباق کی چند مثالیں:

مظہر زفقر طرفہ کمالی بہم رساند | بیگانہ شد زخلق و زحق آشنا نہ شد
ظاہر و باطن ہمہ نذر و نیاز عشق بود | درد پنہانی و داغ آشکاری داشتم
بسکہ در چشمہا گر دیدہ و در دلہا گراں | نہال سرو را با قامتش چند انکہ سنجیدم
عمر ما در عین ہشیاری بغفلت رفت حیف | آنچہ بیداری گماں کردیم خوابی بودہ است

میرزا صاحب نے کبھی کبھی رعایت لفظی سے بھی کام لیا ہے لیکن شعر کی لطافت کو لفظی بازی گری پر قربان نہیں کیا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سرو مہر پیمای چرخ دون ہلاکم کردہ بود | روی گرم آفتابی دیدہ جانی یافتم
سرت گردم چو نرگس در خیال چشم مخمورت | بجای اشک کہ مژگان من ایاغ بہ دل آرد
شنیعم روز حشر این دیدہ نمناک می گردد | ازیں آب رواں آخر حسابم پاک می گردد
پیس ازیں در گلشن میخانہ مسکن داشتم | داغہا چوں لالہ جای گل بدامن داشتم

اگرچہ عام طور پر غزل کا ہر شعر اپنے مطلب و مفہوم میں منفرد ہوتا ہے لیکن پھر بھی ابتدا ہی سے غزل مسلسل کے نمونے بھی ملتے ہیں، ان غزلوں میں ایک ہی موضوع سے متعلق سلسلہ وار شعر ہوتے ہیں، رودکی مشہور غزل جس کا مطلع ہے:

یاد یار مہرباں آید ہمی | بوی جوی مولیاں آید ہمی

فارسی شاعری کا ذوق رکھنے والے کبھی نہیں بھول سکتے۔ حافظ نے خصوصیت کے ساتھ غزل مسلسل دوسروں سے زیادہ کہی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا، چنانچہ ہر اچھے شاعر کے دیوان میں دو چار مسلسل غزلیں ضرور ملیں گی، میرزا مظہر کے مختصر سے دیوان میں بھی تین غزلیں ہیں جنھیں غزل مسلسل کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک غزل یہاں نقل کی جاتی ہے:

یاد ایامیکہ یاری غمگساری داشتم | با غم ہجر و سری در وصل کاری داشتم

ظاہر و باطن ہمہ نذر و نیاز عشق بود — درد پنہانی و داغ آشکاری داشتم
دل درون سینہ دائم ہمچو بسمل می طپید — روز و شب با بیقراریہا قراری داشتم
بر سر ناز نینی گاہ پای می گذاشت — باہمہ بے اعتباری اعتباری داشتم
نوجواناں شور عشق و عاشقی منت سماست — پیش ازین من ہم دل ہنگامہ داری داشتم

ابتداءً غزل عشقیہ مضامین کے لئے مخصوص تھی کیونکہ اس کی ابتدا عشق و محبت کے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں زندگی کے دوسرے موضوعات بھی داخل ہوتے گئے، یہاں تک کہ سیاست بھی اس کے لطیف دائرے میں داخل ہو گئی، تقریباً تمام غزل گو شعرا کے یہاں فلسفۂ حیات، اخلاق، تصوف، پند و نصیحت وغیرہ پر اشعار ملتے ہیں، لیکن سیاسی مضامین کم شعرا کے یہاں ملتے ہیں، اوپر بتایا جا چکا ہے کہ میرزا صاحب اپنے عہد کے سیاسی حالات سے دلچسپی رکھتے تھے، اور ان سے متاثر ہوتے تھے، لیکن ان کے کلام میں سیاسی اشارے نہیں ملتے، حدیث دیگراں کے پردے میں انھوں نے اگر کچھ کہا ہو تو اس کا پتہ لگانا مشکل ہے،

فارسی غزل گوئی کے غائر مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

(۱) محبوب حسن صورت کے لحاظ سے تو بہت اچھا ہے لیکن اخلاقی حیثیت سے بہت گرا ہوا ہے،

(۲) عاشق میں خودداری کی کمی ہے، وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے،

(۳) اظہار جذبات میں واقعیت کا دخل بہت کم ہے، وہ خارجیت کی مصوری اور آورد کا مجموعہ ہے،

میرزا صاحب کا کلام ان عیوب سے قطعی پاک ہے، ان کا محبوب شاہد حقیقی ہے،

جس کی ہر ادا پر قربان ہونا ایک عاشق کا منتہائے عاشقی ہے، ان کے یہاں جذبۂ فدائیت کے ساتھ جذبۂ خودداری بھی ہے، اگر وہ ایک طرف یہ اظہار کرتے ہیں کہ

بخاک و خون طپم و گوئی از برای منست | ہزار عمر فدای وی کہ من از شوق

تو دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں:-

تو زندہ باش خریدار بندہ بسیار است | اگر ز بندگی چون منی ترا عار است

جن جذبات کا انھوں نے اظہار کیا ہے ان کی بنیاد داخلیت پر ہے، اس لئے ان میں واقعیت ہے، اور چونکہ واقعیت ہے اس لئے وہ درد و تاثیر سے خالی نہیں،

میرزا مظہر کا اسلوب بیان شگفتہ و دلکش ہے، حسن دوست اور لطافت پسند انسان کی ہر بات میں شگفتگی پائی جاتی ہے، ان کے یہاں فارسی غزل کی روایت یعنی لطیف اشارے کنائے ملتے ہیں، انھوں نے خصوصیت کے ساتھ بہار، گل، بلبل، قفس، آشیاں وغیرہ کی علامتیں زیادہ استعمال کی ہیں، یہ علامتیں ہماری زندگی کی اچھی ترجمانی کرتی ہیں، ان علامتوں کے استعمال سے میرزا صاحب کے کلام میں حسن بھی پیدا ہو گیا ہے، اور تاثیر بھی، بحروں کے انتخاب میں بھی انھوں نے احتیاط برتی ہے، سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہہ کر اپنے زور بیان کا ثبوت دینے کی سعی نہیں کی بلکہ عموماً مترنم بحروں اور شگفتہ زمینوں کا انتخاب کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے کلام میں غنائیت پیدا ہو گئی ہے، اس غنائیت یا موسیقی کو ان کے انتخاب الفاظ کے سلیقہ نے بھی تقویت پہنچائی ہے اور اسلوب بیان پر قدرت ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں روانی اور چستی پیدا ہو گئی ہے، لیکن چند اشعار دیوان میں ایسے بھی ملتے ہیں، جن میں تعقید لفظی پائی جاتی ہے، اوپر مختلف عنوانات کے تحت جو اشعار نقل کئے گئے ہیں ان میں سے

اکثر و بیشتر میں مندرجہ بالا خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں، صاحب مخزن الغرائب کا بیان ہے کہ

"در بعضے اشعار محاورانی کہ در ہند مشہور شدہ اند و نزد فارسیاں صحت ندارند ہم از زبان مبارکش گوش زد سامعان گشتہ و ادای ہندی نیز در کلامش بستہ شدہ امادر آخر خس و خاشاک را از گلستاں بیروں کردہ ہرچہ نگاہ داشت ہمہ خوب است"[۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرزا صاحب کا جو کلام اس وقت موجود ہے وہ بیان سے قطع نظر زبان کے لحاظ سے بھی بہت خوب ہے، لیکن ان کے گلستان سخن میں کچھ "خس و خاشاک" اب بھی نظر آتے ہیں، مثلاً بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی ملتی ہیں جنھیں ایران کے اہل زبان شاید صحیح تسلیم نہ کریں، جیسے،

بے بیجا، نظر بازی، مزاجدان، خرچ بالائی، حسن بالادست، بند وبست، وضع گرفت، دوبالا، بندۂ تجویز تقدیر، تیز وغیرہ،

اسی طرح مندرجۂ ذیل الفاظ بجائے فارسی مفہوم میں استعمال ہونے کے اردو کے مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں، فرصت، دولت، پریشان، غصہ، نقصان،

ایک شعر میں "صورت آئینہ ساں" اور ایک دوسرے شعر میں "چوں صورت فانوس خیال" کی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں جو قواعد کی رو سے صحیح نہیں،

بعض ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو غزل کی لطافت کے منافی ہیں، مثلاً جوز وج لکنت زبان، کم ظرف وغیرہ،

لیکن ان کی حقیقت بالکل ایسی ہے جیسے ایک خوب صورت چمن میں جس میں نہایت

---

[۱] احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب قلمی،

خوش رنگ وخوش نما پھول بڑی تعداد میں ہیں، دو چار تنکے ادھر ادھر پڑے ہوں، ان تنکوں کی موجودگی سے پھولوں کی خوش نمائی وشادابی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ ان کی وجہ سے باغ کی رعنائی میں کوئی فرق آسکتا ہے، اگر ایک ہزار اشعار میں گنتی کے چند ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اہل زبان کے نزدیک قابل قبول نہیں تو اس سے شاعر کے پورے کلام پر اثر نہیں پڑ سکتا، ان چند الفاظ کے مقابل میں جن کا اوپر ذکر ہوا بیسیوں شگفتہ ترکیبیں ملیں گی، مندرجہ ذیل ترکیبوں کی ندرت اور شگفتگی سے کون انکار کر سکتا ہے،

نخل شعلہ، ستارۂ سوختہ، شعلۂ ادراک، شمع ادراک، مصر جنون،
ذرۂ داماں، صبح فتنہ زا، نالۂ زور آور، صدمۂ باد، شاخ نافرمان،
کاغذ آتش زدہ وغیرہ،

محاورے اور روزمرے میرزا صاحب نے اہل زبان کے طریقے پر استعمال کئے ہیں، مثلاً

آبے نزد بروی گراں خواب بخت ما — باآنکہ گریہ داد بہ سیلاب رخت ما
زعشق او بداغی کی تسلی می شوم منظر — کہ غرق سوختن چوں شعلہ می خواہم سراپا را
امتحان صبر عاشق ایں قدرہا خوب نیست — ای بقربانت روم آخر دلت ایوب نیست
ہر بلبلی چو غنچہ سری زیر بال داشت — امروز باغ بے تو قیامت ملال داشت
ہمچو آں ابر کہ برہم خورد از صدمۂ باد — کہ را نالۂ زور آورم از جا بر داشت
سرت گردم چو نرگس در خیال چشم مخمورت — بجای اشک ہر مژگان من ساغر بروں آرد
ابر رحمت کہ دریغش ز ترشح ننگ است — چشم دارم کہ ز دو زخ شرری نہ گذارد
یک درچشمہا گر دیدہ ور دلہا گراں — نہال سرو را با قامتش چند انکہ سنجیدم

ان شواہد کی موجودگی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا یہ بیان کہ "اہل سخن را در زبان ایشاں حرفہاست[1]" قابل قبول نہیں ہو سکتا، زبان اور خصوصاً محاورہ اور روزمرہ کے استعمال میں خود اہل زبان غلطی کر جاتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تقریباً ہزار سالہ فارسی شاعری کے پورے دور میں امیر خسرو کو چھوڑ کر، اگر کوئی ہندوستانی شاعر ایسا ملتا ہے جس نے فارسی زبان کو اہل زبان کی طرح برتا ہے تو وہ مولانا شبلی ہیں، مولانا نے اپنے آپ کو بلبل شیراز سے تشبیہ دی ہے، یہ تشبیہ بالکل صحیح ہے، میرزا غالب بھی اپنے دعوے فارسی دانی کے باوجود اس کلئے سے مستثنیٰ نہیں، ایسی صورت میں شاعر کی زبان پر مجموعی حیثیت سے نگاہ ڈالنی چاہئے، مجموعی حیثیت سے میرزا مظہر کی زبان صحیح اچھی اور شگفتہ ہے،

دیوان میں دس رباعیاں بھی ہیں، یہ سب کی سب عشقیہ رباعیاں ہیں، یہ بھی غزلوں کی طرح کیفیات عشق میں ڈوبی ہوئی ہیں، انداز بیان بھی شگفتہ اور دلکش ہے، یہاں مثالاً دو رباعیاں نقل کی جاتی ہیں،

باعیش و طرب کہ آرمیدیم چہ شد؟ — از رنج و الما کہ طپیدیم چہ شد؟
اکنوں کہ بدل حسرت روی داریم — دیدیم چہ شد؟ و ندیدیم چہ شد؟

اشکم تا کوی دلربائی نرسید — ایں آب ... ف خاکپای نرسید
ایں نالہ و آہ سرد راہی نکشود — فریاد! فریاد بجای نرسید

میرزا صاحب نے دو تضمینیں بھی کی ہیں، پہلی تضمین نیلی کی غزل پر ہے اور دوسری صائب کی غزل پر، ان کا انداز بھی وہی ہے جو ان کی غزلوں کا ہے، دوسری تضمین خصوصاً بہت خوب ہے، پہلا بند ہے،

---

[1] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، گلشن بیخار، ص ۲۶۶

عرق افشاں تو گر ای شوخ پسری آئی   دست چوں بسلۂ ترکاں بہ کمری آئی
جامۂ سبز چو شمشاد ببری آئی   چہرہ افروختہ چوں گل بہ نظری آئی

از شکارِ دل گرمِ کہ دگرمی آئی ؟

چند بند واسوخت کے عنوان کے تحت بھی ہیں، یہ اشعار واسوخت کے تمام شرائط پورے نہیں کرتے اور انھیں مشکل سے واسوخت کہا جا سکتا ہے، لیکن ان اشعار میں جذبات عشق کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے، تمام بند درد و تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں، اسلوب بیان میں بڑی دل کشی ہے، یہاں مثالاً بعض بند نقل کیے جاتے ہیں، پہلے دو بند ہیں،

روزی بقاصدی سرراہی شدم دوچار   پرسیدمش ز مظہرِ دیوانگی شعار
آہی کشید وگفت کہ از دستِ روزگار   آں بلبلی کہ بی رخِ گل بود بے قرار

اکنوں مئی طرب بایاغش نمی رسد
گل می رسد بباغ دماغش نمی رسد

گاہی چو سیل سوی بیاباں نمی رود   چوں ابر تر بجانبِ مستاں نمی رود
بلبل صفت بہ سیرِ گلستاں نمی رود   پروانہ وار سوی چراغاں نمی رود

از بے دلی بہ کنجِ غمی عہد بستہ است
وز بے کسی بماتمِ خود، خود نشستہ است

آخری بند میں بے کسی و حرماں نصیبی کا مرقع بڑی عمدگی سے کھینچا ہے،

بر دو تم بہ دشمنی آہنگ می کند   با ہر کہ آشتی بکنم جنگ می کند
سینہ بمن معاملۂ جنگ می کند   داغم اگر مرگ نیز بمن خنگ می کند

ای چرخ بر سرِ چو منی بے کسی غریب
اللہ اکبر ! ایں ہمہ بیداد یا نصیب

دو نہایت مختصر مثنویاں ہیں، پہلی میں صرف دس شعر ہیں اور دوسری میں تیس، پہلی مثنوی کے اشعار حقیقت میں تمہیدی اشعار ہیں، ممکن ہے کہ میرزا صاحب کو کوئی مثنوی لکھنے کا خیال آیا ہو، اور تمہیداً یہ اشعار لکھے ہوں اور پھر مثنوی لکھنے کا موقع نہ ملا ہو،

حمد و نعت میں فارسی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے، صوفی شعرا مثلاً امیر خسرو، سعدی، جامی وغیرہ کے حمدیہ و نعتیہ اشعار خصوصاً وجد آگیں و کیف آور ہیں، میرزا صاحب نے بھی حمد و نعت میں چار شعر کہے ہیں، ان میں بڑی محبت و عقیدت کا اظہار پایا جاتا ہے، محبت و عقیدت سے قطع نظر ان اشعار کی بلاغت بھی قابل داد ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ چار شعر فارسی کے حمدیہ و نعتیہ کلام میں ایک ممتاز جگہ پانے کے مستحق ہیں،

خدا در انتظار حمد ما نیست — محمد چشم بر راہ ثنا نیست

خدا مدح آفرین مصطفیٰ بس — محمد حامد حمد خدا بس

مناجاتی اگر باید تواں کرد — بہ بیتی ہم قناعت می تواں کرد

محمد از تو می خواہم خدا را — الٰہی از تو عشق مصطفیٰ را

دوسری مثنوی عشقیہ مثنوی ہے، اس میں شاعر نے ہجر کا نقشہ کھینچا ہے، اور بڑے لطیف و مؤثر انداز میں کھینچا ہے، چند منتخب اشعار یہاں مثالاً نقل کئے جاتے ہیں،

سرت گردم ای قاصد کوی یار — زمن سجدہ ای بر در آں نگار

ازاں پس بآں شوخ پیماں گسل — بگو ای دل جان و ایمان دل

چناں بے تو از خویش آزردہ ام
کہ از دست ایں زندگی مردہ ام

دل مرگ سوز و باآں ناتواں
کہ از زندگی رنجہ باشد بجاں

شود مطلع گر ز احوالِ من
کند گریہ ہم گریہ بر حالِ من

ازیں رہ بجرأت قدم می زنم
باظہار احوال دم می زنم

کہ ہرگز نبود ایں امیدم ز بخت
بزنداں کشم در چنیں فصل رخت

ز زنداں پی امتحانم برآر
بطور خودم ساعتی واگذار

بصد جاں گرفتار رای تو ام
بدل بندۂ جور ہای تو ام

عطا کن دلم را حیات ابد
براتم بدہ بر نجاتِ ابد

بایں لطف شرمندۂ خویش کن
ز آزادی بندۂ خویش کن

ولیکن نہ آزادی از دام عشق
کہ صد عید قربان ایام عشق

(۳)

اردو کلام

میرزا مظہرؒ کا اردو کلام بہت کم پایا جاتا ہے، اگرچہ تذکرۂ مسرت افزا میں لکھا ہے کہ "دیوان فارسی و ریختہ مرتب دارد"[۱] اور غالباً اسی بیان کی بنیاد پر گارساں دتاسی نے بھی لکھ دیا کہ ان کا ہندوستانی و فارسی کا دیوان موجود ہے[۲]، لیکن اس کی تائید کسی معاصر یا بعد کے تذکرے سے نہیں ہوتی، میر تقی میر، فتح علی گردیزی، قائم چاندپوری، افضل بیگ قاقشاں، حمید اورنگ آبادی، لچھمی نرائن شفیق، قدرت اللہ شوق، میر حسن، مصحفی، قدرت اللہ قاسم، مصطفیٰ خاں شیفتہ کسی نے بھی ان کے اردو دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ "گاہی گاہی" اردو میں اشعار کہا کرتے تھے اور صرف "چند اشعار ریختہ" ان کی یادگار ہیں، مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو لکھتے ہیں کہ "گاہ گاہی ریختہ..... می گفت"[۳]

صاحب عیار الشعرا کا بھی یہی بیان ہے: گاہ گاہی ہمت گرامی بہ تصنیف بعضی

---

[۱] ابو الحسن امیر احمد، تذکرۂ مسرت افزا بحوالۂ معاصر پٹنہ، ج ۲، حصہ، [۲] تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی، ج دوم، ص ۷۹، [۳] مجمع النفائس، قلمی،

غزلیات ہندوی ہم مصروف می فرمودے[۱]"

عشقی عظیم آبادی کے یہ الفاظ ہیں: "گاہ گاہ بحسب اتفاق مطلعی و غزل بزبان ریختہ نیز فرمودند[۲]"

قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے کہ "معدودی از اشعار ریختہ کہ در ایام سالف از طبع دُرپاش ریختہ ہم منقوش صفحات لیل و نہار است[۳]"

احد علی یکتا لکھنوی لکھتے ہیں کہ "بیشتر فارسی می گفت و ریختہ ہمیں قدر کہ برای اصلاح بعضی از شاگردان او بکار آید یا بکدام خیالی دیگر بقلت می فرمود[۴]"

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے مصنف نے لکھا ہے کہ "بپاس خاطر میر موصوف (میر عبد الحیٔ تاباں کے) کبھی کبھی ہندی شعر بھی زبان پر جاری ہوتا ورنہ وہ فارسی گوئی میں نام آوری رکھتا تھا[۵]"

گردیزی میرزا صاحب کی شعر گوئی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "اکثر می از اشعارش از راہ بے پروائی از صفحۂ خاطر محو و نسی شدند و برخی از عدم اعتنا و توجہ با یں مہجور و ابتر گشتند[۶]"

اسی طرح صاحب تذکرۂ مسرت افزا کا بیان ہے کہ "از بی نیازی و بی پروائی چوں قصد تدوین و حفاظت ندارد اکثری از احاطۂ خاطر می رود مگر آنچہ بگوش طالباں رسیدہ و حرز جان و تعویذ دل و جان گردیدہ[۷]"

---

[۱] خوب چند ذکا، عیار الشعرا قلمی، [۲] تذکرۂ عشقی [۳] مجموعۂ نغز، جلد دوم، ص ۱۹۸، [۴] دستور الفصاحت، ص ۲۴، [۵] سعادت خاں ناصر، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، جلد اول، ص ۲۴، [۶] فتح علی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویان، ص ۱۳۱، [۷] ابو الحسن امیر احمد، تذکرۂ مسرت افزا مجلۂ معاصر پٹنا،

میرزا صاحب نے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "(فقیر) سر جمع اجزای کلیات و مسودات نداشت و بیشتر سرمایۂ سخنش بباد رفت[۱]"

لیکن دیباچہ کی عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بیس ہزار (فارسی) اشعار جمع ہو گئے تھے، جن میں سے میرزا صاحب نے صرف ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا، اس لئے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ میرزا صاحب کا فارسی کلام بہت کچھ ضائع ہو گیا یہ بھی ممکن ہے کہ گردیزی اور ابوالحسن نے ان کی جس "بے نیازی" "بے پروائی" اور "عدم اعتنا و توجہ" کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں اردو کلام بھی شامل ہو، کیونکہ تذکرۂ ریختہ گویان (گردیزی) اور تذکرۂ مسرت افزا (ابوالحسن) دونوں اردو شعرا کے تذکرے ہیں، جب خود شاعر کو اپنے کلام سے اعتنا نہ ہو تو اس کا محفوظ رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

اس سلسلے کی سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ جواہر سخن کے مرتب نے میرزا صاحب کے اردو کلام کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "شاہ شاہد علی صاحب سبز پوش، تخلص فانی رئیس گورکھپور کا بیان ہے کہ میرزا صاحب کا مکمل دیوان اردو قلمی کتب خانہ خانقاہ جونپور میں موجود ہے[۲]"

مدت ہوئی مؤلف نے اس نسخے کا پتہ لگانے کی کوشش کی تھی، لیکن افسوس کہ جونپور کی خانقاہ میں اس کا کوئی وجود نہ تھا، اگر شاہ شاہد علی صاحب کا بیان صحیح ہے تو میرزا صاحب کے اردو دیوان کا غائب ہو جانا دنیائے اردو کا ایک ایسا سانحہ ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

میرزا صاحب کی اردو شعر گوئی (یا ترک شعر گوئی) سے متعلق مصحفی نے ایک بڑی

---

[۱] میرزا مظہر: دیوان مظہر، دیباچہ [۲] مبین چریاکوٹی: جواہر سخن، جلد اول ص ۳، ۴،

عجیب بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "چوں دراں روز ہا با میر عبد الحئی تاباں دوستی بسیار داشت، چند غزلیات متعددہ از خارۂ فکرش بر صفحۂ کاغذ ریختہ بودند کہ متاثر الہام آمد۔ آخر ایشاں قرار شعر گفتن خود بزبان فارسی دادند و بعد ازیں بہ ریختہ زباں نیالودند"[۱]

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے مصنف کا بیان اوپر نقل کیا جا چکا ہے، وہ مصحفی کے بیان کے بالکل برعکس ہے، اس کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مصحفی کے تذکرہ ہندی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، یعنی مصحفی کے بیان کی تردید کی گئی ہے،

مصحفی نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی کہ تاباں نے میرزا صاحب کو یہ مشورہ کیوں دیا، البتہ لچھمی نرائن شفیق نے اس کی توجیہہ بلا دلیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "میرزا مظہر جان جاناں چوں حسب گفتار یقین بایں درجہ دیدیا ریختہ ہای کہ بیش ازیں سر زدہ طبع میرزا شدہ اکتفا کردہ از شعر ریختہ دست کشیدہ"[۲]

شفیق کو یقین سے بے انتہا عقیدت و محبت تھی، اور انھوں نے یقین کے حالات و خصائص لکھنے میں ضرورت سے زیادہ عقیدت کا اظہار کیا ہے یا بقول مولوی عبد الحق "اس قدر مبالغہ بلکہ غلو سے کام لیا ہے کہ خلاف عادت شفیق کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا، وہ اسے اردو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہند و دکن میں کسی کو اس کی ٹکر کا نہیں سمجھتا، یقین کا تذکرہ اور کلام ۴۷ صفحوں میں درج ہے، اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ اس شاعر کو کیا سمجھتا تھا"[۳]

شفیق کو دراصل میر تقی میر پر غصہ ہے، میر نے طبیق کو مبتذل بند کہا ہے، ذائقہ شعری

---

[۱] تذکرہ ہندی، ص ۲۰۳ [۲] چمنستان شعرا، مقدمہ، ص ۱۶۳ [۳] ایضاً مقدمہ، ص ۱۴.

سے محروم بتایا ہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھیں شعر کہنا نہیں آتا تھا، ان کے استاد میرزا مظہر جان جاناں انھیں شعر کہہ کر دیا کرتے تھے اور ان کا سارا دیوان حقیقۃً میرزا مظہر کی کاوش کا نتیجہ ہے[1]۔ یہ بات شفیق کو ناگوار گذری، دوسروں کو بھی بری معلوم ہوئی، لیکن اس کے ردعمل کے طور پر جو کچھ لکھا گیا وہ بھی مبالغے سے خالی نہیں، یقین کا دیوان چھپ گیا ہے۔ ان کو ایک اچھا شاعر ماننے کے باوجود "یکتائی عصر" اور یگانۂ زمانہ نہیں کہا جا سکتا۔

حمید اورنگ آبادی نے بھی لکھا ہے کہ " در خدمت مرزا رسوخ تمام داشت۔ بنا بریں مرزا خود بہ تخلص یقین ارشاد فرمودند"[2]۔ مبتلا لکھنوی کا بیان ہے کہ " راقم وی را در دہلی بارہا دید استعداد سخن سنجی چنداں نداشت۔ میرزا مظہر از فرط الفت اشعار خود را بنام او کردہ اشتہار داد"[3]۔ عنایت حسین خاں مہجور رکھتے ہیں کہ " شاعر مذکور سوادی نداشت۔ مرزا اشعار خود نامزد اوی فرمود"[4]۔ مصحفی کا کہنا ہے کہ " دیوانش از نظر مرزا بخوبی گذشتہ بلکہ بقول بعضی ہمہ کلامش گفتۂ مرزاست"[5]۔ بعض اور تذکرہ نگاروں نے بھی لفظوں کے الٹ پھیر کے ساتھ یہی بات کہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام بیانات کو میر کی صدائے بازگشت سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

مذکورۂ بالا قضیے کے ضمن میں میر حسن لکھتے ہیں کہ

" میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ مشہور ہے کہ مرزا مظہر نے (یقین کو) پورا دیوان لکھ کر دیا ہے، وہ خود شعر موزوں نہیں کر سکتے، مجھے اس بات پر یقین نہیں

---

[1] نکات الشعراء، ص ۱۰۱ [2] گلشن گفتار، [3] گلشن سخن، ص ۲۶۵

[4] مدائح الشعراء بحوالۂ احمد علی خاں یکتا لکھنوی دستور الفصاحت، ص ۲۸، حاشیہ

[5] تذکرۂ ہندی ص ۲۷۵

آتا تھا، لیکن مرزا رفیع سودا اور میر سوز نے گواہی دی کہ ایک دن ہم لوگ انعام اللہ خاں یقین کے مکان پر گئے اور امتحاناً غزل کیلئے ایک طرح دی گئی، ہم نے بہت انھیں اکسایا لیکن وہ ایک مصرع بھی موزوں نہ کر سکے، سخن فہمی بھی ان میں نہیں پائی گئی؛[1]

خود میر نے بھی شہاب الدین ثاقب کی زبانی بالکل اسی طرح کے امتحان کا ذکر کیا ہے، لیکن ان گواہیوں کے باوجود یقین پر وہ فرد جرم عاید نہیں ہو سکتی جو میر نے لگائی ہے، شاعر اپنے لئے شعر کہتا ہے، جب اس پر جذبۂ فکر طاری ہوتا ہے تب وہ شعر کہتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر یقین نے قصداً غزل نہ کہی ہو یہ سمجھ کر کہ میرا امتحان لیا جا رہا ہے،

مذکورۂ بالا بیانات کے مقابلے میں قدرت اللہ قاسم کا یہ بیان ملتا ہے کہ "شاعر بی نظیر محمد تقی میر در تذکرۂ خود قلمی نمودہ کہ دیوان وی از آں مرزای مغفور است، افترای محض و کذب خالص است کہ از عم حسد از وی سرزد اکثر غزلہا بدیہہ بحضور سراپا سرور، آگاہ رموز جلی و خفی سید فتح علی خاں حسینی دام ظلہم گفتہ؛[2]

قدرت اللہ قاسم کا یہ جوابی بیان میر کے بیان کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اور واضح اور مدلل طور سے میر کے بیان کی تردید کی گئی ہے، اس لئے نہ صرف میر کا بیان غلط ثابت ہوتا ہے بلکہ سودا اور سوز کی گواہیاں بھی ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہیں،

دیوان یقین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے، کسی غزل میں نہ اس سے زیادہ شعر ہیں اور نہ اس سے کم۔ یہ التزام ایک نوجوان

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۲۰۱ [2] مجموعۂ نغز، حصہ دوم

ہی کر سکتا ہے، میرزا صاحب جیسے صوفی سے اس طفلانہ اہتمام کو نسبت دینا ان کی توہین کے مترادف ہوگا،

آخر میں صاحب تذکرۂ مسرت افزا کا بیان بھی سن لینا چاہیے جو انھوں نے تلاش و تحقیق کے بعد دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ،

"زبان آوراں از مضامین رنگیں اشعارش رشک خوردہ انکار می نمودند سخنوراں از صفائی تازہ و خوش آئین کلامش متحیر شدہ بجانب حضرت میرزا مظہر منسوب می کردند لیکن تجسس کنندگان و تفحص جویندگان آخر خود مقر شدہ اند کہ ایں اشعار بالیقین زادۂ طبع یقین است[۱]"

یہ یقیناً صحیح نہیں ہو سکتا کہ میرزا صاحب یقین کو شعر کہہ کر دیا کرتے تھے، خود میر کو بھی اقرار ہے کہ "ہمہ چیز بوارث می رسد الاشعر[۲]" قدرت اللہ شوق جو میرزا صاحب اور یقین دونوں کے ہم عصر تھے اور دہلی ہی میں رہتے تھے، اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "بعضی شعرا گمان بردہ اند کہ یقین شعر گفتن نمی دانست، میرزا مظہر او را شعر گفتہ می داد، محض خطاست، فاما در اشعارش اکثر اصلاح استاد بیشتر است چیزی مضائقہ ندارد[۳]"

مصحفی کا بھی بیان ہے کہ "بہ تربیت انعام اللہ خاں نسبت بہ محمد فقیہ دردمند پر توجہ بودند[۴]" خود یقین کے حالات میں انھوں نے لکھا ہے کہ "دیوانش از نظر میرزا بخوبی گذشتہ ...[۵]" قائم نے اپنے تذکرے میں میرزا صاحب کے اشعار نقل کرنے

۱؎ ابوالحسن امیر احمد، مجلہ معاصر، پٹنہ حصہ ۴ ۲؎ نکات الشعراء، ۳؎ طبقات الشعرا
۴؎ تذکرۂ ہندی، ص ۲۰۳ ۵؎ ایضاً ص ۲۷۵

سے پہلے یہ جملہ لکھا ہے: "از برای تربیت یقین گفتہ"[۱] اس بات کا امکان ہے کہ غایت محبت میں میرزا صاحب نے کبھی کبھی ایک آدھ شعر غزل میں اپنی طرف سے بڑھا دئے ہوں، مثلاً، مندرجہ ذیل اشعار جو تذکرۂ مسرت افزا، تذکرۂ ہندی اور مجموعۂ نغز میں میرزا صاحب کی طرف منسوب ہیں، دیوان یقین میں پائے جاتے ہیں،

مت اختلاط کر اے نوبہار ہم سے — چمن کے ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں
یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے — قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

میرزا صاحب کی اردو شعر گوئی (یا ترک شعر گوئی) کے ضمن میں سراج الدین علی خاں آرزو کا بیان خصوصی اہمیت رکھتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "گاہ گاہی ریختہ بطریق خاصہ می گفت، والا خلاف زئی خود دانستہ ترک گفتہ بعضی از تلامذۂ خود را تربیت بسیار کردہ حتی کہ بعض می گویند خود گفتہ داد، واللہ اعلم"[۲] آرزو نے میرزا صاحب کے کلام پر جامع تذکرہ بھی کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ انھوں نے اردو شعر گوئی کیوں ترک کی، وہ ایک مرشد و ہادی تھے، ان کے وقت کا زیادہ حصہ "ارشاد طالبان و تعلیم و تربیت یاراں" میں صرف ہوتا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ شعر و شاعری کے لئے وہ بہت زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے، جو کچھ تھوڑا بہت وقت نکال سکتے تھے وہ ایسے شاگردوں کی نذر ہو جاتا تھا جو اردو سے زیادہ دل چسپی رکھتے تھے، یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اردو شاعری کا ستارہ کافی بلندی پر پہنچ چکا ہے، اس لئے اردو شاعری سے نوجوانوں کی دل چسپی ایک فطری بات ہے اور اسی دل چسپی کے پیش نظر میرزا صاحب نے ان نوجوان شعرا کی ہمت افزائی کی، شاید تربیت بیاد

---

[۱] مخزن نکات [۲] مجمع النفائس، قلمی،

نے مذکورہ بالا غلط فہمی پیدا کر دی ہو،

ابتدا میں خود میرزا صاحب کا ایک بیان نقل کیا جا چکا ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اب مجھے شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں رہی اور یہ کہ تیس سال سے میں رشد و ہدایت میں مشغول ہوں، ان کا مروجہ فارسی دیوان ۱۱۷۰ھ میں مرتب ہوتا ہے اور ان کی وفات ۱۱۹۵ھ کی ابتدا میں ہوتی ہے، اس پچیس برس کی مدت میں، جیسا کہ مذکورۂ بالا بیان اور مکتوب سے پتہ چلتا ہے، انھوں نے شاید چند شعر کہے ہوں، جس طرح انھوں نے فارسی میں شعر کہنا ترک کر دیا اسی طرح اردو میں بھی، جس میں وہ یوں بھی کم کہا کرتے تھے، چھوڑ دیا ہوگا، اس لئے شفیق کا یہ بیان کہ یقین کے کلام کی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے میرزا صاحب نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا، قابل قبول نہیں ہو سکتا،

اوپر صاحب تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ میرزا صاحب میر عبدالحیٔ تاباں کے پاس خاطر سے اردو میں شعر کہا کرتے تھے، یہ بھی مسلم ہے کہ میرزا صاحب تاباں کو بہت عزیز رکھتے تھے، اس لئے اگر تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے مصنف کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو میرزا صاحب کے اردو میں شعر گوئی ترک کرنے کی ایک معقول وجہ تاباں کی وفات بھی قرار پا سکتی ہے، تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے مابین ہوا،[1]

اصلاحی کوششیں:

میرزا مظہر اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو اصلاح کا دور

---

[1] دیوان تاباں، مرتبہ مولوی عبدالحق، مقدمہ از مرتب، ص د

کہلاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو شاعری میں صنعت ایہام کا رواج بہت زیادہ ہو گیا تھا، اور شاعری لفظوں کا کھیل بن گئی تھی یا بقول کریم الدین "غلط، مکروہ، سبک اور مبتذل الفاظ و معانی کا مجموعہ تھی"[1]، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے بعض اکابر اساتذہ کو بھی تذکرہ نگاروں نے پوچ گو لکھا اور ان کے ادعائے شاعری کے باوجود ان کے کلام کو لطف سے خالی پایا، میرزا صاحب بھی کبھی کبھی اسی طرز میں کہا کرتے تھے لیکن وہی پہلے شاعر ہیں جنھیں اردو شاعری کی اصلاح کا خیال ہوا، انھوں نے اردو شاعری سے ایہام کی صنعت کو ترک کیا اور دوبارہ اس میں لطافت خیال اور سادگیٔ بیان پیدا کی، صاحب طبقات الشعرا میرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ان کا بیان ہے: "می گویند کہ اول کسیکہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوی معلای شاہ جہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ .... میرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر مردی است فرشتہ صفت"[2]

مصحفی کے بیان سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "در ابتدای شوق شعر کہ ہنوز از میر و میرزا وغیرہ کسی در عرصہ نیامدہ بود در ایہام گویان بود اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست .... فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باین وتیرہ باعتقاد فقیر میرزا است بعدہ تتبعش بدیگران رسیدہ"[3]

احمد علی یکتا لکھنوی اپنی قابل قدر تصنیف دستور الفصاحت کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ،

---

[1] طبقات شعرائے ہند، ص ۱۱، [2] قدرت اللہ شوق. طبقات الشعرا. قلمی،
[3] تذکرۂ ہندی، ص ۲۰۳،

"سادہ گفتن شعر از تکلف ایہام و دیگر صنعت نامطبوع کہ رسم شعرای دودۂ فردوس آرام گاہ بود و معنی را قریب الفہم بوضعی با صفا ومتانت بستن کہ سامع محتاج شرح و لغت دم استماع نشود و در گفتن ہر قسم شعر...... و در ہر باب متبع و مقلد فارسیاں بودن بنا گذاشتۂ میرزا جان جاناں مظہر است[1]"

خاتمہ کتاب پر وہ پھر کہتے ہیں کہ " ہمہ شعرا باستاذی او مقر بودند و درستی کلام خود بنا بر اصلاح و تصحیح او مسلم و موقوف می دانستند بلکہ اعتقاد جمعی از تحقیق ہمیں است کہ بانی بنای ریختہ بطرز فارسی اول جناب ایشان است.... و دیگراں ہمہ متبع و مقلد او ہستند[2]"

میرزا صاحب نے زبان کی صفائی و شستگی کی طرف بھی توجہ کی برج بھاشا اور دکنی کے الفاظ جو ولی کی مقبولیت اور تقلید کی وجہ سے اردو شاعری میں داخل ہو گئے تھے شعر کی لطافت پر بار تھے، میرزا مظہر نے زبان کو ثقیل اور بوجھل الفاظ سے پاک کرنے کی کوشش کی، چنانچہ کیتا، جیو، نین، سنسار، بسرنا وغیرہ متروک قرار پائے، اسی طرح بہت سے عربی و فارسی الفاظ اردو میں صوتی لحاظ سے لکھے جاتے تھے، میرزا صاحب نے انھیں اصل شکل میں لکھنا شروع کیا، مثلاً تسبی کے بجائے تسبیح دوانہ کے بجائے دیوانہ وغیرہ،

سید احمد علی خاں یکتا نے ان کی ان کوششوں کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے،

"بعضی تصفیہ محاورۂ اردو را بصفائیکہ مروج است بمرزا جان جاناں المتخلص بہ

---

[1] دستور الفصاحت، ص، [2] ایضاً، ص ۱۲۴،

مظہر کہ یکی از مشاہیر صوفیۂ ایں عصر گذشتہ، نسبت دہند واللہ اعلم۔" خاتمۂ کتاب پر وہ پھر لکھتے ہیں، "بدانکہ اسامی چند کس از شعرا کہ دریں رسالہ ضبط شدہ بعضی ازیں بمنزلۂ اصل اند چہ بنای صحت محاورۂ اردوی معلا بر مقولۂ اینہا متحقق گشتہ یعنی مثل میرزا محمد رفیع و میر محمد تقی و مرزا جان جاناں مظہر تخلص و میر درد وقائم و سوز۔"[۲]

مخزن الغرائب اگرچہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے لیکن تذکرہ نگار نے میرزا صاحب کی اردو شاعری سے متعلق بھی مختصراً لکھا ہے، ان کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "بانی زبان اردو در ریختہ او (میرزا مظہر) بودہ است والا بیشتر شعر گفتن یاراں بہ تقلید ولی دکنی بود۔"[۳] سوزش کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے: "اشعار ریختہ قبل ازیں بہ طور آبرو و ولی مردمان دہلی می گفتند ایں طور را کہ الحال مردماں می گویند آں حضرت (میرزا مظہر) رواج دادہ۔"[۴]

مولانا محمد حسین آزاد کی رائے ہے کہ "میرزا مظہر جان جاناں، سودا، میر، خواجہ درد، چار شخص تھے کہ جنھوں نے زبان اردو کو خراد اتارا ہے۔"[۵]

مولانا آزاد نے خود میرزا صاحب کے حالات میں اپنے اس قول کی وضاحت کردی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "(میرزا صاحب نے) زبان اردو کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا پہلے گذرے تھے انھیں پیچھے چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کرلیا۔ اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا جس سے پرانا رستہ ایہام گوئی کا زمین شعر

---

[۱] دستور الفصاحت، ص ۶۔ [۲] ایضاً ص ۱۰۳۔ [۳] احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، قلمی [۴] سید غلام حسین شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش قلمی [۵] مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات، ص ۱۳۲۔

سے مٹ گیا[۱]۔

میرزا مظہر کی اصلاحی کوششوں کے نتائج مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایہام کی صنعت کا استعمال ترک ہوا اور صحیح رنگ تغزل پیدا ہوا۔

(۲) برج بھاشا اور دکنی کے بہت سے الفاظ متروک قرار پائے اور زبان میں صفائی و شستگی پیدا ہوئی۔

(۳) فارسی اور ہندی کے عناصر میں توازن پیدا ہوا۔

(۴) عربی و فارسی کے وہ الفاظ جو اردو میں صوتی لحاظ سے لکھے جاتے تھے، اب اپنی اصلی شکل میں لکھے جانے لگے۔

کلام پر تبصرہ:

میرزا صاحب کا اردو کلام اتنا کم پایا جاتا ہے کہ اس کی روشنی میں ان کی اردو شعرگوئی سے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن آثار سے عمارت کی بلندی کا اندازہ بہرحال لگایا جا سکتا ہے ان کے بعض ہم عصروں نے ان کے اردو کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کی شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو جن کا تبحر اور نکتہ سنجی مسلم ہے، کہتے ہیں کہ: "گاہ گاہی ریختہ بطریقۂ خاصہ می گفت[۲]۔"

صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہیں کہ "در زبان ہندی کہ مراد از دوست خیلی فصیح و بلیغ بود[۳]۔" فتح علی گردیزی کی رائے ہے کہ "شعر فارسیش بغایت لطافت و

---

[۱] مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات، ص ۱۴۴ [۲] سراج الدین علی خاں آرزو، مجمع النفائس، قلمی [۳] احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب (قلمی)۔

نظم ریختہ اش بنہایت عذوبت (است)[۱]"۔ افضل بیگ قاقشال کا بیان ہے کہ " در فکر اشعار فارسی و ریختہ، ہندی ادبیات ایہامی عدیم المثال وکلامش ہمہ پر از درد وحال است، تمام اشعارش مقبول طبائع و مرغوب دلہا گشت[۲]"۔ صاحب ریاض حسنی اس طرح ان کی مدح و ثنا کرتے ہیں: " امام الشعرای عصر خود است منصفان سینہ صاف افصح المتاخرین می گویند و در ثنا و مدحش سرو جبیم می پویند[۳]"۔

بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی میرزا صاحب کے اردو کلام کو سراہا ہے اور کمیت سے قطع نظر کر کے کیفیت کی داد دی ہے۔ مثلاً قدرت اللہ قاسم ان کی شعر گوئی و نکتہ سنجی کی اس طرح داد دیتے ہیں: " شعر و شاعری خاصہ ریختہ گوئی دون مرتبۂ آں عالی نہاد است۔ سخن سنجی و نکتہ پیرائی خصوص بزبان ہندوستان ز امی کمینہ رتبۂ آں والا نژاد[۴]"۔ انشا نے اس طرح ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے: " دل اور آنکھ میں کشمکش ہونے لگی کہ کیوں میرزا صاحب کے دیدار سے محروم رہیں اور ان بزرگ کے کلام معجز نظام میں جو لایزال لذت اور مٹھاس ہے اس سے کیوں باز رکھا جائے[۵]"۔

مولانا محمد حسین آزاد کی رائے ہے کہ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے، اور دوں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں، ان کے اصل حال[۶]"۔

افضل بیگ قاقشال اور مولانا آزاد کی رائے ایک ہے، لیکن مولانا نے اپنے

۱؎ فتح علی گردیزی، تذکرۂ ریختہ گویاں ص ۱۳۲ ۲؎ افضل بیگ قاقشال، تحفۃ الشعراء (قلمی)، ۳؎ عنایت اللہ فتوت، ریاض حسنی (قلمی)، ۴؎ قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، جلد دوم ص ۱۹۰ ۵؎ انشاء، دریائے لطافت اردو، ترجمہ از پنڈت برج موہن کیفی ص ۰۰، ۶؎ مولانا محمد حسین آزاد آب حیات ص ۱۴۲

قول کی یہ توجیہہ بھی کر دی ہے کہ اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں، ان کے اصل حال،

احمد علی سندیلوی نے میرزا صاحب کی فارسی شاعری کے سلسلے میں لکھا ہے کہ،
"ازبسکہ کانون سینۂ بی کینہ اش پر از عشق بود بیشتر اشعار عاشقانہ پر درد از قلمش می ریخت [1]" اسی طرح صاحب معمولات مظہریہ نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جسے میرزا صاحب کی فارسی شعر گوئی کے ضمن میں نقل کیا جا چکا ہے، اگرچہ سندیلوی کی رائے اور صاحب معمولات کے بیان کردہ واقعے کا تعلق میرزا صاحب کی فارسی شعرگوئی سے ہے لیکن ان کا اردو کلام بھی اس سے غیر متعلق نہیں ہو سکتا، دل کی تڑپ زبان کے قید و بند سے آزاد ہے،

میرزا صاحب کے اردو کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، وہ اشعار جن کا تعلق ایہام سے ہے اور وہ اشعار جو ترک ایہام گوئی کے بعد کہے گئے، وہ اشعار جن میں صنعت ایہام استعمال ہوئی ہے بحیثیت مجموعی شعری و ادبی نقطۂ نگاہ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، نہ ان میں لطافت خیال ہے، اور نہ اسلوب بیان کی ندرت و دلکشی، بلکہ بعض اشعار تو تہذیب و متانت سے گرے ہوئے نظر آتے ہیں، ذیل کے چند ایہامی اشعار استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں لطافت خیال بھی ہے اور حسن بیان بھی، جذبات کی مصوری بھی ہے اور محسوسات کی عکاسی بھی،

ایک دم کوں بلبلو کیوں بیٹھتی ہو پھول پھول ۔۔۔ اب کوئی ساعت میں آصیاد کرتا ہے طول
لالہ بدل ہے داغ ترے مکھ کا خال دیکھ ۔۔۔ پھولے ہیں گل چمن میں صنم کا جمال دیکھ

---

[1] احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب (قلمی)

بلبل فدا ہوئی ہے ترے رخ پہ اے صنم ۔۔۔ سنبل ہے پیچ پیچ ترے زلف وہاں دیکھ

جھکی ہے فوج گل، اور عندلیباں کی پکار آئی ۔۔۔ ارے ہنستا ہے کیا وہ دیکھ دیوانے بہار آئی

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی ۔۔۔ فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی

کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بولو ۔۔۔ کہ آخر ایک ہی آپس میں دونوں بیچ رشتا ہے

وہ اشعار جو میرزا صاحب نے ترک ایہام گوئی کے بعد کہے قدیم معیار غزل گوئی پر پورے اترتے ہیں، ان میں محبت و شیفتگی، جذبۂ فدائیت، سوز و گداز اور ندرت بیان پائی جاتی ہے، ہوسناکی، بے حمیتی اور مایوسی والمناکی سے ان کا کلام پاک ہے، ان کا دل سوز عشق کا آتش کدہ ہے، ان کے جذبات و تصورات میں ایک خوشگوار تنوع ہے،

میرزا صاحب کے کلام میں جو بات سب سے نمایاں ہے وہ اس کی داخلیت ہے، انھوں نے وہی کہا ہے جو محسوس کیا ہے، ان کے اشعار میں ان کے تخیلات و افکار کی صحیح تصویر نظر آتی ہے، وہ عشق کے زخم خوردہ تھے، اس کے مختلف کیفیتوں سے آگاہ تھے، حسن کی ایک ایک ادا کے رمز شناس تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں واردات و کیفیات عشق کے اظہار کی فراوانی ہے اور ان کے کلام کو ان کی شخصیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے، یہاں مثالاً چند شعر نقل کیے جاتے ہیں،

جنوں سوں اس قدر روئیں کہ رسوا ہو گئیں آخر ۔۔۔ ڈبایا ہائی ان آنکھوں نے آخر خاناں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے ۔۔۔ اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا ۔۔۔ اس قدر جور و جفا کا بھی سزا دار نہ تھا[1]

---

[1] قائم چاند پوری نے بھی اسی خیال کو اسی قافیے میں اس طرح ادا کیا ہے،

کب میں کہتا ہوں کہ تیرا میں گنہگار نہ تھا ۔۔۔ لیکن اتنی تو عقوبت کا سزاوار نہ تھا،

جب چلاوں نہ چلا ترے داماں پہ زور ہاتھ ناچار مکدر ہو گریباں کو چلا

گل کو جو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں دُر کو جو دُر کہوں تو اس آنسو کو کیا کہوں

مجھ پر ہوا ہے تنگ سجن عرصۂ سخن بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اک دم تو چپ رہے آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

اگر ملئے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

ذیل کی غزل میں واردات حسن و عشق کی اچھی مصوری کی گئی ہے اور زبان کی قدامت کے باوجود صفائی و روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے. لفظ دیکھا کی تکرار نے شعروں کو حسین تر بنا دیا ہے،

سحر اس حسن کے خورشید کوں جا کر جگا دیکھا ظہور حق کوں دیکھا، خوب دیکھا، باضیا دیکھا
سجن کس کس مزہ سے آج دیکھا مجھ طرف یارو اشارت کر کے دیکھا، ہنس کے دیکھا، مسکرا دیکھا
میں دیکھا رات اس کی زلف کے بندوں کوں (؟) سحر زنجیر دیکھا، دام دیکھا، اژدہا دیکھا
نہیں پایا ہے رونے کوں اور فریاد کوں یا دل برس دیکھا جھڑی کوں باندھ دیکھا کڑکڑا دیکھا

نہیں ملتا مرا نازک ہٹیلا کیا کروں مظہر
تصدق ہو کے دیکھا، پاؤں پڑ دیکھا، منا دیکھا

دوسری خاص بات جو میرزا صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ سوز و گداز ہے،

اور یہ بھی حقیقت میں داخلیت کا نتیجہ ہے، جیسا کہ ابھی اوپر کہا گیا وہ عشق کے زخم خوردہ تھے، اس لئے ان کے دل میں تڑپ تھی، وہ صوفی تھے، اس لئے زندگی ان کی نگاہ میں ایک بے حقیقت چیز تھی، دنیا ان کے نقطۂ نگاہ سے صرف دیکھنے کی چیز تھی، برتنے کی نہیں، یہاں خوشیاں کم ہیں حسرتیں زیادہ، انسان شہنشاہ کائنات ہونے کے باوجود مجبور محض ہے، اس کی زندگی رسوائی سے عبارت ہے اور اس کا انجام فنا ہے، ان احساسات و کیفیات کے زیر اثر میرزا صاحب کے کلام میں سوز و گداز کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی، لیکن ان کے اشعار نے مرثیئے کا رنگ اختیار نہیں کیا بلکہ ان میں تغزل کی پوری شان موجود ہے، مثالاً چند شعر یہاں دئے جاتے ہیں،

گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا — صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

اس کے دل میں کبھی تاثیر نہ کی — اے محبت اسے کیا کہتے ہیں؟

رونے سے تجھ فراق کے آنکھیں مری گئیں — ڈوبا یہ خاندان اس آنسو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے یک دم تو چپ رہے — آخر مرا یہ دل ہے الٰہی جرس نہیں

آتش کہو شرارہ کہو کوئلا کہو — مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی — یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی

ان داخلی کیفیات و واردات اور سوز و گداز کے اظہار کے ساتھ ساتھ میرزا صاحب کے یہاں شاعرانہ سرمستی و بادہ نوشی اور نغمہ و سرود کی بھی ہلکی سی آواز

آجاتی ہے،

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

بہار آئی، کھل آئے باغ بلبل پھول کر بیٹھی
دوانوں کو کہو اس وقت کر لیویں علاج اپنا

مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہاتھ جوہری و پنکھا صبا کے ہاتھ

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سیں
مینا لگا ہے جب سیتی مجھ بے نوا کے ہاتھ

جھکی ہے فوج گل اور عندلیباں کی پکار آئی
ارے ہنستا ہے کیا وہ دیکھ دیوانے بہار آئی

میرزا صاحب صوفی تھے، ان کی ساری عمر سلوک اور ارشاد و ہدایت میں گذری، اس لئے صوفیانہ مضامین کا ان کے یہاں ہونا ناگزیر تھا، انھوں نے "سر دلبری" کو بڑی دلکشی وندرت کے ساتھ فاش کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ ان اشعار میں زہد کی خشکی نہیں بلکہ تغزل کی رنگینی و رعنائی ہے، مثلاً چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں،

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سیں
مینا لگا ہے جب سیتی مجھ بے نوا کے ہاتھ

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

گذر گئے دین و دنیا سے تس پر
ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے

اگر ملئے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے
غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دبر اپنے کی
کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو گیا قیامت ہے

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

اسلوبِ بیان:

میرزا صاحب کا اسلوب بیان سادہ مگر شگفتہ و دل کش ہے، وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے اور پھر صوفی تھے، اس لئے انھوں نے "سرِ دلبراں" کو حدیثِ دیگراں کے پردے میں ظاہر کرنے پر عمل کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فارسی غزل کی روایت یعنی اشارے اور کنائے زیادہ ملتے ہیں، انھوں نے چمن، گل، بلبل، آشیاں وغیرہ کی علامتیں خصوصاً زیادہ استعمال کی ہیں، ان اشاروں اور کنایوں کی وجہ سے ان کے کلام میں حسن بھی پیدا ہوگیا ہے، اور تاثیر بھی انکے یہاں بحروں کے استعمال میں تنوع ہے انھوں نے عموماً مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے، جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں غنائیت پیدا ہوگئی ہے، انتخاب الفاظ میں بھی وہ بڑی مہارت رکھتے ہیں صدق محاورہ اور صفائی زبان کی ان کے یہاں اچھی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان کا کلام تعقید لفظی سے یکسر پاک نہیں، صنائع و بدائع کا استعمال بھی ان کے یہاں کم ہوا ہے، مگر جو صنعت بھی استعمال کی ہے بڑی خوبصورتی سے کی ہے،

زبان:

میرزا صاحب کی زبان رفتہ و شستہ ہے، انھوں نے کرخت اور ثقیل الفاظ جن کا بوجھ غزل برداشت نہیں کرسکتی، استعمال نہیں کئے ہیں، لیکن دو ایک جگہ وہ غلط العوام کو غلط العام کے اصول پر استعمال کر گئے ہیں، مثلاً مجھ طرف، شتابی وغیرہ فعل متعدی کا استعمال انھوں نے کئی جگہ دکنی طریقہ پر کیا ہے، جیسے، میں دیکھا، سجن دیکھا وغیرہ، مگر آئیاں جائیاں وغیرہ سے جو میر و سودا کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں ان کا کلام پاک ہے، واو عطف کا غلط استعمال اس زمانہ کے چلن کے مطابق وہ

ایک موقع پر ہوا ہے، مثلاً چوبزی وپنکھا، اسی طرح اضافت کا غلط استعمال بھی کہیں کہیں ملتا ہے، جیسے بیڑۂ پان،

میرزا صاحب کے عہد میں س اور ص یا ر اور ڑ کا قافیہ جائز سمجھا جاتا تھا، تسبیح کو تسی، صحیح کو صحی باندھتے تھے، اسی طرح متحرک لفظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک بنا دیا کرتے تھے، ان کے اشعار میں س اور ص کا ایک بھی قافیہ نہیں ملتا، صرف ایک شعر میں انھوں نے را اور ڑ کا قافیہ باندھا ہے، وہ شعر یہ ہے:

نہ جانوں صبحدم بادِ صبا کیا جا پکار آئی | کہ غنچہ کا دل نازک چمن کے بیچ پھاڑ آئی

اسی طرح مندرجۂ ذیل شعر میں ساکن کو متحرک کے طور پر استعمال کیا گیا ہے،

دیکھ کر گل نے کہا تجھ پہ نزاکت ہے ختم | کس ادا ساتھ لچکتا ہے یہ مارِ دامن

چند متروکات بھی مثلاً مکھ (بجائے منہ) لگ (بجائے تک یا تلک) آوتے (بجائے آنے) وغیرہ ان کے یہاں پائے جاتے ہیں، لیکن بہت ممکن ہے کہ جن غزلوں یا اشعار میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ اس زمانہ کے ہوں جب میرزا صاحب متروک نہ کئے ہوں، سوں، سیں، ستی وغیرہ ان تذکروں میں نقل کئے ہوئے اشعار میں ملتے ہیں، جو دکن میں لکھے گئے، مثلاً تذکرۂ ریختہ گویاں (گردیزی)، میں یہ مصرع اس طرح نقل ہوا ہے،

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے

یہی مصرع تحفۃ الشعرا (افضل بیگ قاقشال)، میں اس طرح ملتا ہے:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سوں زندگی کرتے

اس لئے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ خود میرزا صاحب نے سوں، سیں، ستی

وغیرہ استعمال نہیں کیا یا آگے چل کر ترک کر دیا، لیکن دکن کے تذکرہ نگاروں نے چلن کے مطابق سے کے بجائے سوں یا سی لکھ دیا،

میرزا صاحب کو فارسی سے بہت لگاؤ تھا، اس کا اثر ان کے اردو کلام پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ ان کے یہاں بہت سی شگفتہ ترکیبیں ملتی ہیں، مثلاً

مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو — آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو

میں روتا ہوں یہ دل کی بے کسی پر ہائے دل میرا — نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں پیمان گسل میرا

سورج کے ہاتھ جوڑی وپنکھا صبا کے ہاتھ — مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر

یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی — کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی

کس ادا ساتھ لچکتا ہے یہ مار دامن — دیکھ کر گل نے کہا تجھ پہ نزاکت ہے ختم

فارسیت کے زیر اثر میرزا صاحب نے بعض فارسی محاروں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے، مثلاً

چمن میں کس بھروسے باندھتا ہے آشیاں اپنا (آشیاں بستن) — نہ گل اپنا، گیا میں نے نہ بلبل باغباں اپنا

دیا برباد پروانے نیں ناحق دودماں اپنا (برباد دادن) — کہیں دیے نیں جی کے وصل ہونا ہاتھ لگتا ہے

تصدق ہو کے دیکھا، پاؤں پڑ دیکھا منا دیکھا (تصدق شدن) — کبھی ملتا نہیں میرا ہٹیلا کیا کروں مظہر

یہ مقتولوں میں ٹک بسمل رہا ہے (غنیمت دانستن) — غنیمت جان قائل جان مظہر

(مولانا) محمد حسین آزاد نے میرزا جان جاناں مظہر کی زبان کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ "زبان ان کی نہایت صاف وشستہ اور شفاف ہے[1]" پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "جو سودا اور میر کی زبان ہے وہی ان کی زبان ہے[2]" مگر اس تعریفی جملے

---

[1] آب حیات، بار دوازدہم، ص ۱۴۲ [2] ایضاً، ص ۱۴۳،

انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ کے کتب خانہ کے کلیاتِ سودا کے ایک نسخے میں بھی جس پر سنہ کتابت درج نہیں، یہ قطعہ پایا جاتا ہے، اور دو لفظی اختلافات سے قطع نظر بالکل اسی شکل سے نقل ہوا ہے، جیسے اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ کے ۱۲۴۱ھ والے نسخے میں لکھا گیا ہے، اس کے علاوہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کے ایک نسخے میں جو ۱۲۳۸ھ کا مخطوطہ ہے، یہ قطعہ ملتا ہے، اور دو ایک خفیف لفظی اختلافات سے قطع نظر اسی طرح سے نقل ہوا ہے، جیسے مذکورۂ بالا نسخے میں درج ہے، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد کے ایک نسخے میں جو ۱۲۳۷ھ کا مخطوطہ ہے، یہ قطعہ ملتا ہے، اور اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ کے ۱۲۲۹ھ والے نسخے کے مطابق ہے،

مذکورۂ بالا نسخوں کے واضح اختلافات قطعہ کو مشکوک بناتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً اس میں ترمیم ہوئی ہے یا تدریجاً اس میں تراش خراش کی گئی ہے، جن نسخوں کے سال کتابت معلوم ہیں وہ سودا کی وفات (رجب ۱۱۹۵ھ) کے بہت بعد کے مخطوطے ہیں اس لئے ان میں الحاقی کلام کے ہونے کا امکان ہے، مولانا آزاد لائبریری کا نسخہ (سلیمان کلکشن) خصوصاً مشکوک ہے کیونکہ اس میں کی بیشتر پہیلیاں، سلام، مرثیے وغیرہ ایسے ہیں جو دوسرے نسخوں میں نہیں پائے جاتے،

شیخ چاند مرحوم اور ڈاکٹر خلیق انجم نے کلیات سودا کے دو نسخوں کو مستند مانا ہے، ایک نسخہ وہ ہے جو مرحوم حبیب الرحمان خاں شیروانی کے کتب خانے میں تھا اور اب مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حبیب کلکشن میں ہے، ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیق کے مطابق یہ کلیات سودا کا سب سے قدیم نسخہ ہے، اور ربیع الثانی

۱۱۸۷ھ کو اس کی کتابت مکمل ہوئی[1] دوسرا نسخہ وہ ہے جو سودا نے اودھ کے نائب رزیڈنٹ رچرڈ جانسن کو تحفۃً دیا تھا، اور جو اس وقت انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں محفوظ ہے، یہ نسخہ بقول ڈاکٹر خلیق انجم ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتب ہوا[2] اور کلیات سودا کے معتبر ترین نسخوں میں ہے[3] ان دونوں نسخوں میں مذکورہ بالا قطعہ نہیں پایا جاتا۔

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونیورسٹی کلکشن میں کلیات سودا کے دو نسخے ہیں، ان میں سے ایک میں سنہ کتابت نہیں ہے اور دوسرا ۱۲۲۱ھ کا مخطوطہ ہے، یہ دونوں نسخے بھی قطعہ مزبور سے خالی ہیں،

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانے میں بھی اس نسخے کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، دو مخطوطے اور محفوظ ہیں، ان میں سے ایک نسخے پر تاریخ تحریر درج نہیں، لیکن دوسرے کا سنہ کتابت ۱۱۹۵ھ ہے جو سودا کا سال وفات ہے، ان دو نسخوں میں زیر بحث قطعہ نہیں ہے،

کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں مذکورہ بالا مخطوطے کے علاوہ چار نسخے اور ہیں، ان میں سے ایک کا سال کتابت نامعلوم ہے، بلکہ یہ نسخہ نامکمل ہے، باقی تین کے سنہ کتابت ۱۲۲۰ھ، ۱۲۴۶ھ اور ۱۲۷۹ھ ہیں، ان تینوں نسخوں میں قطعۂ مزبور نہیں پایا جاتا،

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) حیدرآباد میں بھی مذکورہ بالا نسخے کے علاوہ دو مخطوطے اور ہیں، دونوں میں سنہ کتابت درج نہیں یہ دونوں مخطوطے قطعہ زیر بحث سے خالی ہیں،

---

[1] مرزا محمد رفیع سودا، ص ۴۴ و ۵۴۴ [2] ایضاً، ص ۵۴۴ [3] ایضاً، ص ۴۴۶

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد کے کتب خانے میں کلیات سودا کے دو اچھے مخطوطے محفوظ ہیں، ایک کی تاریخ ترتیب قبل ۱۱۹۴ھ اور سنہ کتابت ۱۲۱۳ھ ہے اور دوسرے کی تاریخ ترتیب ۱۱۹۴ھ اور سال کتابت ۱۱۹۵ھ ہے، یعنی یہ نسخہ سودا کی زندگی میں یا ان کی وفات کے فوراً بعد لکھا گیا، کیونکہ ان کی تاریخ وفات ۴ رجب ۱۱۹۵ھ ہے، ادارہ مزبور کی فہرست مخطوطات کے مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ "اس کلیات کے آغاز میں اصلح الدین کا لکھا ہوا فارسی نثر میں دیباچہ ہے جو سودا کی موجودگی میں لکھا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سودا کی زندگی ہی میں مرتب کیا گیا ہے"[۱] ان دونوں نسخوں میں قطعہ مزبور نہیں ہے،

رضا لائبریری رام پور میں کلیات سودا کے سات نسخے ہیں، ان میں سے صرف ایک نسخے میں سنہ کتابت درج ہے اور وہ سنہ ۱۲۱۹ھ ہے ان نسخوں میں سے کسی ایک میں بھی مذکورہ بالا قطعہ نہیں ملتا،

نول کشور پریس لکھنؤ کے چھپے ہوئے کلیات سودا کے متعدد اڈیشن ملتے ہیں، ان میں یہ قطعہ نہیں ہے، حالانکہ ان میں الحاقی کلام بھی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے،

ان شواہد کی موجودگی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ زیر بحث قطعہ سودا کا نہیں ہو سکتا بلکہ الحاقی کلام ہے،

نکات الشعرا تذکرہ ریختہ گویاں، مخزن نکات وغیرہ میں جو میرزا مظہر کے ہم عصروں کے لکھے ہوئے تذکرے ہیں، ایک بات مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ

---

[۱] فہرست مخطوطات اردو، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد ۳۴ء ج اول ص ۱۰۳،

میرزا صاحب کی شعر شاعری ہنگام جوانی تک تھی، بعد میں وہ اگر اس طرف توجہ بھی فرماتے تھے تو محض تفریحاً، خود میرزا صاحب نے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اب واردات تازہ کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، سودا ۱۱۸۵ھ تک دہلی میں رہے، اگر ان کو میرزا صاحب کی زبان پر اعتراض ہوتا تو وہ قطعہ ان کے پہلے (یا سب سے قدیم) نسخے (۱۱۷۴ھ) میں موجود ہوتا لکھنؤ پہنچ کر ان کا یہ قطعہ لکھنا قیاس سے دور معلوم ہوتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میرزا صاحب شعر گوئی تقریباً ترک کر چکے تھے،

حضرت میرزا مظہر کی اس عہد کے لحاظ سے شستہ و رفتہ زبان اور شگفتہ انداز بیان کے علاوہ سودا کو اختلافِ عقائد کے باوجود میرزا صاحب سے جو محبت و عقیدت تھی اس کی شہادت وہ قطعہ تاریخ ہے جو انھوں نے میرزا صاحب کے شہید ہونے پر کہا تھا، اسے نیچے نقل کیا جاتا ہے، یہ بھی ذہن میں رہے کہ میرزا صاحب کا قاتل سودا کا ہم عقیدہ یعنی شیعہ تھا،

مظہر کا ہوا قاتل جو اک مرتد شوم	اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ وفات ان کی کہی بار وئے درد	سودا نے کہ، ہائے جان جاناں مظلوم

اس احترام و عقیدت کے پیش نظر یہ باور کرنا مشکل ہے کہ سودا نے سب آداب اور رعایتوں کو بالائے طاق رکھ کر، یہ قطعہ کہا ہو گا، جس میں انتہا درجے کی گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ہے،

یہاں پر عشقی عظیم آبادی کا یہ بیان بھی نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ "اکثر از سخنوران آں عہد مثل میرزا رفیع سودا و میر تقی میر بادیاب صحبتش رحجت

میرزا مظہر) می گردیدند و دقائق فنون شعر و سخن بطریق استفادہ می پرسیدند[۱]"۔

بعض دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی میرزا صاحب کی زبان کی تعریف کی ہے، مثلاً میر حسن جو تذکرہ نگاروں میں اپنی شعر فہمی و نکتہ سنجی کے لئے ممتاز ہیں، میرزا صاحب کو "فصحائے زمان و بلغائے دوران" میں شمار کرتے ہیں۔[۲] مصحفی نے ان کی فصاحتِ زبان کا اس طریقے سے اعتراف کیا ہے: "در تمام دیوانش (دیوان یقین) فصاحت و بلاغت زبان استاذ (میرزا مظہر) جلوۂ ظہور می دہد[۳]"۔ صاحب عمدہ منتخبہ کی رائے ہے کہ "الحق کہ شلش در فصاحت و محاورہ دانی بالفعل پیدا نیست[۴]"۔

انشاء اللہ خاں انشا نے دریائے لطافت میں اپنی اور میرزا صاحب کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ "جناب فیض مآب میرزا صاحب علیہ الرحمۃ میرزا جان جاناں مظہر تخلص کی فصاحت اور بلاغت کی شہرت بے حد سننے میں آئی تھی[۵]"۔ انھوں نے میرزا صاحب کی زبان کی ایک جگہ اور بالواسطہ تعریف کی ہے، میر عفر غینی کی زبان سے وہ کہتے ہیں کہ "میر انشاء اللہ خاں... اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں، میرزا مظہر جان جاناں کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں[۶]"۔

سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی اگرچہ بذاتِ خود میرزا محمد رفیع سودا کو "افصح

---

[۱] دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد جلد ۲، تذکرۂ عشقی، پٹنہ ۱۹۶۳ع، ص ۱۸۱ [۲] تذکرۂ شعرائے اردو، مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، طبع جدید دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۰ع، ص ۔ [۳] تذکرۂ ہندی مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۳ع ص ۲۰۳ [۴] ص ۵۵۲ [۵] اردو ترجمہ از پنڈت کیفی اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ہند ۱۹۳۵ع، ص ۲۷ [۶] ایضاً ص ۹۵،

الفصحا و ابلغ البلغا" مانتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "بعضی تصفیہ محاورۂ اردو را بصفائیکہ مروج است بہ مرزا جانِ جاناں المتخلص بہ مظہر کہ یکی از مشاہیر صوفیہ ایں عصر گذشتہ نسبت دہند واللہ اعلم" پھر خاتمہ کتاب پر وہ میرزا صاحب کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف انھیں "آفتاب چرخ فصاحت و نیر اعظم فلک بلاغت" کہہ کر کرتے ہیں اور یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ "در اوستادی و زبان دانی اُو ہر گز شک نیست[1]"

میرزا صاحب کا اردو کلام کمیت کے لحاظ سے بہت کم ہے، لیکن کیفیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم ہے اور اسے ہمیشہ قبولیت عامہ حاصل رہی ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد کے کتب خانے میں "کلام اردو شعرائے شمالی ہند" نام کی ایک بیاض ہے، اس کا تعارف کراتے ہوئے فہرست مخطوطات کے مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک شمالی ہند کے شعرا میں صرف درد، سودا، مظہر اور یقین کا کلام اورنگ آباد میں مقبول ہوا تھا[2]۔"

نامی ارکاٹی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں (یا بہارستان عشق) کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ

"اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۳ھ تک اردو کے حسب ذیل شعرا اساتذۂ سخن سمجھے جاتے تھے اور ان کی شہرت اورنگ آباد سے حیدر آباد ہوتی ہوئی ارکاٹ اور مدراس تک پہنچ چکی تھی؛ ولی، سراج، آبرو، مظہر، میر، سودا، سوز، حشمت، آرزو، عزلت، عاجز، درد، بیان، فغاں، ممنون، عفت، مصحفی، جرأت، تاباں[3]۔"

---

[1] اردو ترجمہ از پنڈت کیفی: اورنگ آباد انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۵ع ص ۲۰۳ [2] جلد چہارم، ص ۲۶۶ [3] ایضاً ص ۶۹

نکالنا غلط نہ ہوگا کہ میرزا صاحب نے بالقصد زیادہ تر غیر معروف شعرا کے کلام کا انتخاب کیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مشہور و معروف شعرا کے کلام کا انتخاب تو اکثر تذکروں میں مل جاتا ہے، لیکن غیر معروف شعرا کا چونکہ تذکروں میں ذکر نہیں ہوتا اس لئے ان کے جواہر پارے بھی عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں، اور واقعی اس انتخاب کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیسے کیسے جواہر پارے اپنی آب و تاب دکھائے بغیر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار:

آں کس کہ یاد او نکنی در ہزار سال ——— روزی ہزار بار ترا یاد می کند
(خواجہ صفی)

اے جنس وفا ہوس تو متاعی بجہاں نیست ——— عیب تو ہمین ست کہ در کشور یابی
(میر اختر یزدی)

راز نہان محمل او می تواں شنید ——— افغان! کہ با زبان جرس آشنا نیم
(حکیم الہی)

چندیں قفس ز شوخیٔ بال و پرم شکست ——— آہ! از کجا نصیب من ایں اضطراب شد
(خواجہ افضل بیگ)

اضطرابم نگذارد کہ نشینم جائی ——— انتظارت نگذارد کہ ز جا برخیزم
(عبدالباقی بزرگی)

بیم از وفا ندارد وعدہ کہ من ——— از ذوق ایں نوید بفردا نمی رسم
(عبدالسلام پیامی)

کاش ای محرم نمی پرسیدم کآں مہ کجاست ——— یک سخن گفتی و از چندیں لگام سوختی
(مولانا حزنی اصفہانی)

چو طفل مریضم بعہد زمانہ ——— بہر عضو درد دی و گفتن ندانم
(خواری تبریزی)

گیرم کہ رود قاصد من سوئے دیارش ——— با او کہ دہد نامہ و پیغام کہ گوید
(ملا صباحی)

مارا بنامہ نیز فراموش کردہ ——— دانستہ کہ دیدہ ما را سواد نیست
(ملا بیانی)

یہ انتخاب یقیناً میرزا صاحب نے حافظہ کی مدد سے کیا ہوگا، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بعض شعرا کا انتخاب دو جگہ آیا ہے، یعنی ایک شاعر کے کچھ اشعار

پہلے لکھے، پھر اور بعض شاعروں کے اشعار نقل کرنے کے بعد اس شاعر کے چند اور اشعار یاد آگئے اور انھیں بھی نقل کر دیا مثلاً طالب آملی کا انتخاب (ص ۷۰) پر بھی ہے اور ص ۱۰۱ پر بھی، نظیری نیشاپوری کے کلام کا انتخاب ص ۱۳۰ پر بھی ہے، اور صفحہ ۱۳۹ پر بھی، ملک قمی کے اشعار کا انتخاب پہلے صفحہ ۱۲۱ پر ہے، پھر دو شاعروں کے کلام کے بعد صفحہ ۱۲۲ پر اور پھر ایک شاعر کے چند اشعار کے بعد اسی صفحہ پر۔

خریطۂ جواہر میں عموماً ہر شاعر کے معدودے چند اشعار دیئے گئے ہیں، ایسے شعرا کی کافی تعداد ہے جن کے صرف ایک ہی شعر کا انتخاب ہوا ہے، لیکن مندرجۂ ذیل شعرا کے اشعار کا نسبتہً زیادہ انتخاب کیا گیا ہے، اور اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کن شعرا سے زیادہ متاثر تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے تذکرہ نگار شاعروں کی طرح میرزا صاحب نے بھی سب سے زیادہ اپنے ہی اشعار کا انتخاب کیا ہے۔

شاپور طہرانی	۲۲ اشعار	میر صیدی طہرانی	۳۱ اشعار
میرزا قلی	۲۳ اشعار	نظیری نیشاپوری	۳۱ "
امیر خسرو	۲۳ " اور ایک رباعی	عرفی شیرازی	۳۳ "
میرک صالح	۲۶ "	میرزا ولی دوست	۴۲ "
محمد افضل سرخوش	۲۷ "	حکیم شرف الدین شفائی	۵۱ "
طالب آملی	۲۸ " اور ایک رباعی	میر رضی دانش	۵۲ "
ملا باقر کاشانی	۳۰ "	میرزا مظہر	۶۸ "

ان میں سے بعض شعرا مثلاً عرفی، صیدی، میرزا مظہر کے کلام کا انتخاب ردیف وار

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ بعض شعرا کا کلام میرزا صاحب نے ان کے دیوان کی مدد سے کیا ہے،

میرزا صاحب کے فارسی و اردو کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی داخلیت (یا کیفیات عشق کی مصوری) ہے، اشعار کا انتخاب، انتخاب کنندہ کے میلانات کی آئینہ داری کرتا ہے، میرزا صاحب کا کلام ہی نہیں بلکہ زندگی عشق میں ڈوبی ہوئی تھی، اس لئے ان کی نگاہِ انتخاب لازمی طور پر ایسے ہی اشعار پر پڑتی تھی، جن میں عشق اور وارداتِ عشق کا ذکر ہو، اس انتخاب کی ابتدا حضرت ابوسعید ابی الخیر کی رباعیات سے ہوتی ہے، پہلی ہی رباعی ہے،

آں روز کہ آتش محبت افروخت		عاشق روشِ سوز ز معشوق آموخت
از جانب دوست سر زد ایں سوز و گداز		تا در نگرفت شمع پروانہ نسوخت

حضرت ابوسعید ہی کی ایک اور رباعی ہے،

پیر یدز من نگار ہمخانگیم		بدرید ز من لباس فرزانگیم
مجنوں بہ نصیحت دلم می آید		بنگر کہ کجا رسید دیوانگیم

چند مزید اشعار نیچے نقل کئے جاتے ہیں تاکہ میرزا صاحب کی نگاہِ انتخاب کا صحیح صحیح اندازہ ہوسکے:

خواہی بچشم ناز شود کم محبتم		غافل کہ ایں کرشمہ محبت فزوں کند
(اہلی شیرازی)

بصد کرشمہ و نازم شکار خود کردی		کنوں کنارہ گرفتی چو کار خود کردی
(اہلی شیرازی)

دانم کہ سراپای وجودم ہمہ دردست		داغ تو ندانم کہ کجاہست دکجانیست
(ملا باقر کاشانی)

مارا وداع کرد دل و دین ہرچہ بود — الا سر نیاز کہ بر آستاں بماند
(امیر خسرو)

زمردم یاری پرسد کہ حالی کیست طالع ہیں — کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسد اینجا
(نعمت خاں عالی)

حسرت اینست کہ صیاد مرا چندانی — در قفس داشت کہ راہ چمن از یادم شد
(نعمت خاں عالی)

رسوا منم وگرنہ تو صد بار در دلم — رفتی و آمدی و کسی را خبر نہ شد
(نظیری)

بوی یار من ازیں سست وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم
(نظیری)

ناصح زباں کشود کہ تسکیں دہد مرا — نام تو برد باعث صد اضطراب شد
(ہلالی)

با سایہ ترا نمی پسندم — عشق است و ہزار بدگمانی
(والہ داغستانی)

ہر کہ خواہد کہ زکوی تو رود من ضامن — اضطرابش نگذارد کہ قدم بردارد
(میر صیدی)

بانکہ صرف شد ہمہ عمرم بانتظار — آگہ نیم ہنوز کہ چشمم براہ کیست
(میر صیدی)

انتخاب کسی کا ہو اس سے سو فی صدی اتفاق ہونا بہت مشکل ہے، بعض اشعار حالات کی بنا پر ہم کو متاثر کرتے ہیں اور حالات مختلف اشخاص کے مختلف ہوتے ہیں ایسی صورت میں انتخاب پر مجموعی حیثیت سے نگاہ ڈالنی چاہیے، بہ حیثیت مجموعی خریطۂ جواہر کو ایک نہایت عمدہ انتخاب کہہ سکتے ہیں، اس میں ایسے عمدہ اشعار کا انتخاب ہوا ہے جو ہمارے شعری ذوق کی تربیت کر سکتے ہیں، اور جن سے مذاقِ سخن بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے، یعنی یہ پاکیزہ و لطیف اشعار کا انتخاب ہے،

خاتمۂ سخن پر مولانا شبلی کی رائے اس انتخاب سے متعلق نقل کر دینا افادہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکروں کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ،

"ایران میں تذکرہ سے مقصود عمدہ اشعار کا انتخاب ہوتا تھا چنانچہ ابتدائی

تذکرے صرف انتخابات ہیں، مرزا صائب کا انتخاب آج بھی موجود ہے جس میں کسی شاعر کا حال برائے نام بھی نہیں، صرف اشعار ہی اشعار ہیں، لیکن انتخاب اس درجہ کا ہے کہ ہزاروں تذکرے اس پر نثار کر دیے جائیں، والہ داغستانی[1] اور آتش کدۂ آذر میں گو حالات بھی ہیں لیکن اصل خصوصیت موجود ہے۔ بخلاف ان کے خزانۂ عامرہ بلکہ آزاد کے تینوں تذکرے گویا لغو اشعار کا مجموعہ ہیں، تمام کتاب میں مشکل سے ایک آدھ شعر اچھا نکل آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں تمام ہندوستان کا مذاق شاعری سخت خراب ہو چکا تھا، مضمون آفرینی یعنی جھوٹی خیال بندی پر لوگ جان دیتے تھے، زبان کی دل آویزی، لطفِ بندش، لطافت و نزاکت، سے کسی کو غرض نہیں رہی تھی، چنانچہ اس عہد کے جتنے تذکرے ہیں، سب اسی مرض میں مبتلا ہیں، خان آرزو کا مجمع النفائس اس عہد کا عمدہ ترین تذکرہ خیال کیا جاتا ہے، اس کی بھی یہی حالت ہے، یہ بد مذاقی اخیر تک قائم رہی، یہاں تک کہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں نے ریزۂ جواہر[2] انتخاب کیا، میں نے ثقات دہلی سے سنا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاقِ صحیح جو دوبارہ قائم ہوا وہ اس انتخاب نے قائم کیا"[3]

اس ضمن میں مولانا حالی کی رائے بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی، مسعود علی، مرتب سفینۂ شیخ علی حزیں لکھتے ہیں کہ

"تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی صاحب مرحوم

---

[1] ریاض الشعراء، مصنفہ والہ داغستانی۔ [2] معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کے قلم سے سہواً ریزۂ جواہر لکھ گیا ورنہ اس انتخاب کا صحیح نام خریطۂ جواہر ہی ہے [3] مقالات شبلی، ج ۵ ص ۱۲۸۔

حیدرآباد بلائے گئے تھے اور سرکاری مہمان کی حیثیت سے نظام کلب میں مقیم تھے، مولانا کے آرام و آسایش کی نگرانی میرے سپرد تھی، اس لئے مجھے روزانہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ ایک دن مولانا مرحوم میرے یہاں تشریف لائے، خریطۂ جواہر میز پر رکھا ہوا تھا، اسے اٹھا کر ملاحظہ فرمانے لگے اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ دہلی اور لکھنؤ کے مذاق شاعری میں جو فرق ہو گیا اس کے کیا اسباب ہوئے؟ میں نے عرض کیا کہ اسے بجز معاشرتی اور تمدنی ماحول کی تبدیلی کے اور کس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے، فرمایا کہ بے شک، یہ بھی ایک سبب ہوا، مگر سب سے بڑا سبب میرزا صاحب کا یہ انتخاب تھا جو مدت دراز تک دہلی کے شعرا میں دائر و سائر رہا، اسی کا اثر تھا کہ وہ لوگ اساتذۂ فن کے جادہ پر چلے اور بے راہ روی سے محفوظ رہے۔[1]

---

[1] مقدمہ، ص د۔ ہ

(ب) نثر

ا۔ مکاتیب

خط لکھنے کا رواج ہر ملک اور ہر قوم میں رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اسے خصوصاً اہمیت حاصل ہوئی، ان کے عہد میں سلاطین و وزرا، علما و صلحا، حکما و ادبا سبھی کے خطوط جمع و مرتب ہو کر شائع ہوئے، یہ خطوط حسنِ انشا کے علاوہ مذہبی، تاریخی، علمی، فلسفیانہ مباحث کے حامل ہوتے تھے، اور ان سے مکتوب نگار کی شخصیت کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی تھی، اس لئے اس عہد کے لوگوں کے علاوہ آنے والی نسلیں بھی ان سے مستفیض ہوئیں اور اس استفادے کا سلسلہ آج تک جاری ہے، حضرت میرزا جان جاناں مظہرؒ کے مکاتیب بھی اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

میرزا صاحب کے مکاتیب کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، یہ رقعاتِ کرامت سعات، کلماتِ طیبات، مکاتیبِ میرزا مظہر ہیں،

رقعاتِ کرامت سعات کا پورا نام " رقعاتِ کرامت سعات شمس الدین حبیب اللہ حضرت میرزا جان جاناں مظہر شہید رضی اللہ عنہ" ہے، اور اسے ترتیب دینے والے مولوی نعیم اللہ بہرائچی ہیں، یہ حقیقت میں کسی بڑے مجموعے کا انتخاب ہے، کیونکہ مولوی صاحب نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ " ایں نسخۂ تذکیر فیض اکسیر ماخوذ و مستفاد از انوار مشکوٰۃ رقعات فیوض

آیات حضرت میرزا جان جاناں شہید امت" اور اسے انھوں نے "بجہت نفع خاص و عام" کے علاوہ اپنے فرزند غلام احمد کی تعلیم و تربیت کے لئے تیار کیا تھا۔[1] اس میں تریسٹھ ۶۳ خطوط ہیں، اور ہر خط کے مکتوب الیہ کا نام دے دیا گیا ہے، یہ مجموعہ سال ۱۲ھ (۱۸۵۷ء) میں فتح الاخبار (دکول) کے مطبع میں چھپا تھا،

کلمات طیبات کے مرتب کا نام معلوم نہ ہو سکا، اس میں میرزا صاحب کے اٹھاسی ۸۸ مکتوبات ہیں، ان کے مکتوبات کے علاوہ اس میں مندرجۂ ذیل بزرگانِ دین کے مکاتیب بھی ہیں،

۱۔ حضرت غوث الثقلین ۲۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ ۳۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۴۔ حضرت شاہ غلام علیؒ،

ان بزرگوں کے مکاتیب کے اس مجموعے میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے ایک رسالے اسرار العارفین کا فارسی ترجمہ بھی ہے،

اس مجموعے کی اشاعت سے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ،

"یہ کتاب پہلی بار ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں مطبع العلوم مراد آباد سے محمد امجد علی مالک اخبار نیر اعظم کے زیر اہتمام" ۶ ½ اور ۱۰ کے سائز پر شائع ہوئی، مولوی حافظ علی مراد آبادی اس کے مرتب اور مولوی قمر الدین مراد آبادی اور مولوی صدیق حسن سنبھلی نے اس کی تصحیح کی اور حاشیے لکھے، اس مجموعے کا دوسرا اڈیشن ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۱ء) میں پھر اسی مطبع سے شائع ہوا، اس دفعہ مولوی قمر الدین کے ساتھ جو مولوی صدیق حسن سنبھلی کا نام تھا، وہ نکال دیا گیا، پہلے اڈیشن میں منشی انوار حسین تسلیم کی تقریظ شامل ہی، دوسرے اڈیشن میں یہ تقریظ بھی نکال دی گئی اور سائز بھی بدل کر ۶ ½ × ۹ ½" کر دیا گیا،[2]

---

[1] کتاب مذکور، دیباچہ، ص ۲ [2] مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط (مرزا صاحب کے خطوط) ص ۴۱،

مؤلف کے سامنے ایک اور اڈیشن ہے، یہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب کی "تصحیح" اور مولوی حافظ محمد عبداللہ کے "حسن اہتمام" سے مجتبائی پریس، دہلی میں ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) میں چھپا تھا،

تیسرا مجموعہ مکاتیب میرزا مظہرؒ مؤلف کا مرتب کیا ہوا ہے جو علوی بک ڈپو، بمبئی، کی طرف سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا، اس میں مکاتیب کی تعداد ۱۴۷ ہے اور چند کے سوا سب قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے نام لکھے گئے ہیں، یہ سارے خطوط زیادہ تر نجی باتوں پر مشتمل ہیں، اور میرزا صاحب کی زندگی کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی روشنی میں میرزا صاحب کی کتاب زندگی کے بہت سے اوراق روشن ہو کر سامنے آتے ہیں، بہت سی باتیں جو اب تک مبہم تھیں، واضح ہو جاتی ہیں، ان کا افلاس، ان کی تلخ گھریلو زندگی، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اور ان کے اہل و عیال کے ساتھ ان کے گہرے روابط، دوسرے مریدوں اور نیازمندوں سے ان کا اخلاص و مؤدت، بعض حکام وقت وارباب اقتدار سے ان کے تعلقات (اور ساتھ ہی بے نیازی) وغیرہ کا واضح علم ہوتا ہے،

اول الذکر مجموعے کی طرح دوسرے مجموعے (کلمات طیبات) کے اکثر مکاتیب بھی انتخاب کی شکل میں ہیں، بعض خط کئی خطوط کے مجموعے ہیں، مکاتیب میرزا مظہرؒ کے بعض مکتوبات کے انتخابات بھی ان میں شامل ہیں، مثلاً کلمات طیبات کے مکتوب ۸۳ کا ابتدائی حصہ اس مجموعے کے مکتوب ۱۳۶ کا انتخاب ہے، کلمات طیبات کے مکتوب ۵ میں اس مجموعے کے چھ مکاتیب ۹، ۲۷، ۴۶، ۷۳، ۱۰۲، اور ۱۱۷ کے انتخابات شامل ہیں، کلمات طیبات کے مکتوبات ۷ میں اس مجموعے کے تین مکاتیب ۱۶، ۹۷ اور ۱۰۱ کے انتخابات پائے جاتے ہیں،

میرزا صاحب کے مکاتیب کی جمع و ترتیب کی ابتدا ان کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی،

وہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "ایں بی سواد دبستان تحقیق استعداد تصنیف کتاب ندارد، بعض مسائل شریعت وطریقت بطریق جواب کہ احباب سوال کردہ اند، بطور مکاتیب مرقوم شدہ، عزیزاں آں را فراہم آوردہ اند"[1] مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں میرزا صاحب کے مکتوبات کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس میں تیئیس[23] خطوط ہیں، مقامات مظہری میں جو میرزا صاحب کے ایک ممتاز مرید شاہ غلام علیؒ کی تصنیف ہے، یہ خطوط شامل ہیں، یہ مکتوبات اسی ترتیب کے ساتھ کلمات طیبات میں بھی موجود ہیں، غالباً وہ مکاتیب جن کی طرف میرزا صاحب نے اشارہ فرمایا ہے، یہی ہیں، میرزا صاحب کہتے ہیں کہ ان مکاتیب میں بعض مسائل شریعت وطریقت کے جواب دیئے گئے ہیں، چنانچہ پہلے خط کو چھوڑ کر جس میں میرزا صاحب نے اپنے حسب ونسب سے متعلق لکھا ہے، تمام خطوط میں مسائل شریعت وطریقت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے، ایک بار چند مکتوبات جمع وترتیب پاجانے کے بعد ان میں اضافہ ہوتا گیا ہوگا، بعد کے مکاتیب میں شریعت وطریقت کے مسائل کے علاوہ ترویج واشاعت طریقہ، پند ونصائح، تعزیت وہمدردی، شفقت ومحبت وغیرہ کی باتیں بھی ملتی ہیں،

میرزا صاحب نے یہ مکاتیب زیادہ تر اپنے مریدوں کے نام لکھے ہیں، مثلاً قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، مولوی ثناء اللہ سنبھلی، مولوی نعیم اللہ بہرائچی، میر سلمان صاحب وغیرہ چند خطوط بعض عقیدت مندوں کے نام ہیں، جیسے حکیم شریف خاں، نواب عماد الملک، نواب انتظام الدولہ وغیرہ،

میرزا صاحب کے مکتوبات میں موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے، کلمات طیبات کے مکتوبات کے مندرجہ ذیل عنوانات کے ایک سرسری جائزے سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہل وسوم، ص ۴۹،

ا۔ ذاتیات

ا۔ حسب ونسب میرزا صاحب	مکتوب	۱
ب۔ اپنی مشغولیت کا ذکر	"	۷۴
ج۔ اپنے سفر کا مختصر حال	"	۵۲، ۵۴
د۔ ضعف وعلالت کی اطلاع	"	۲۴، ۲۵، ۲۷
		۳۱، ۳۵، ۴۳
		۵۴، ۵۶، ۵۷
ہ۔ دوستوں اور مریدوں کی سفارشیں	"	۲۴، ۲۹، ۳۰
		۳۱، ۳۶، ۴۳
		۴۴، ۴۵، ۴۹
		۵۰، ۵۱، ۵۳
		۶۰، ۶۳، ۶۴
و۔ مریدوں اور ان کے متعلقین	"	۲۶، ۳۰، ۳۱
کی سرگذشت، رحلت وغیرہ،		۳۳، ۴۷، ۸۰
		۸۱، ۸۷، ۸۸
ز۔ تعزیت، ہمدردی، خلوص وشفقت	"	۳۶، ۵۵، ۵۶
		۶۸، ۷۳، ۷۵
		۷۶، ۸۴، ۹
ح۔ اظہار خوشنودی، ہمت افزائی،	"	۵۶، ۷۹، ۸۵

ط ۔ امرا سے بے نیازی، مکتوب ۵۴، ۶۱، ۶۶، ۶۷،

۲ ۔ ارشاد و تعلیم

ا ۔ تعلیم و ترویج و طریقۂ مظہریہ و مجددیہ، ” ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۳۰، ۴۲، ۴۶، ۴۹، ۵۱، ۵۴، ۵۶، ۷۳، ۷۴

ب ۔ پند و نصائح ” ۳۲، ۳۷، ۳۸، ۴۱، ۴۲، ۶۵، ۶۷، ۷۷، ۷۸، ۸۲، ۸۳

ج ۔ سورہ لایلاف کی تلاوت کی تلقین ” ۲۸، ۳۴، ۳۵، ۴۶،

د ۔ ختم خواجگان و ختم حضرت مجدد کی تاکید ” ۲۸،

ہ ۔ دعائے حزب البحر کے ورد کی تلقین ” ۳۵، ۴۰، ۶۸

و ۔ الفقر فخری کا صحیح مفہوم ” ۳۳،

ز ۔ دوسرے سلسلہ کے وابستگان سے متعلق، ” ۵۹،

۳ ۔ حضرت مجدد رح

ا۔ حضرت مجددؒ کے بعض اقوال کے متعلق چند شبہات کا ازالہ	مکتوب ۵، ۶
ب۔ حضرت مجددؒ کا مسئلہ حق ممکنات سے متعلق انکشاف۔	" ۸
ج۔ حضرت مجددؒ اور حضرت غوث الثقلینؒ کا فرق مراتب	" ۷
د۔ طریقۂ مجددیہ کے بعض درجات	" ۲۲
ہ طریقۂ احمدیہ کے متعلق چند شبہات کا ازالہ	" ۲
۴۔ شریعت وطریقت	
ا۔ لفظ "نسبت" صوفیہ کی اصطلاح میں	" ۳
ب۔ علم حضوری وحصولی	" ۴
ج۔ صوفی کا اپنے آپ کو کافر سے بدتر سمجھنا	" ۹
د۔ رفع بلا کے لئے دعا کرنا	" ۱۰
ہ۔ ذکر جہر وذکر خفی	" ۱۱
و۔ مسئلہ سماع	" ۱۲
۸۔ مسئلۂ جبر واختیار	" ۱۳
ح۔ رفع سبابہ	" ۱۵
ط۔ عمل بالحدیث وغیرہ	" ۱۶

ی۔ التزام اتباع سنت سنیہ مکتوب ۲۱

ک۔ مسئلۂ وحدت وجود 〃 ۲۳

ل۔ توحید 〃 ۲۷

م۔ قرآن مجید سے فال لینا 〃 ۶۱

۵۔ علمی و تاریخی مباحث

ا۔ ہندو دھرم اور اس کے آئین 〃 ۱۴

ب۔ حضرت معاویہؓ سے متعلق 〃 ۱۷
اہل سنت وجماعت کا عقیدہ

ج۔ صحابۂ کرام اور اہل بیت سے 〃 ۱۸
متعلق اہل سنت وجماعت کا عقیدہ

د۔ خلفائے قریش 〃 ۱۹

ہ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت 〃 ۲۰
علیؓ کی رنجش،

۶۔ سیاسی بدامنی اور شورش: 〃 ۲۸، ۳۱، ۳۴
۴۶، ۵۰، ۵۳
۵۵، ۶۹، ۷۰
۷۱، ۸۶،

کلمات طیبات کے مندرجۂ ذیل مکاتیب خصوصاً زیادہ اہمیت رکھتے ہیں،
مکتوب اول (حسب ونسب میرزا صاحب)، مکتوب سوم (لفظ "نسبت" صوفیہ کی

اصطلاح میں)، مکتوب چہارم (علم حضوری و حصولی)، مکتوب ششم (حضرت مجددؒ کے چند اقوال پر شبہات کا ازالہ)، مکتوب دوازدہم (مسئلۂ سماع)، مکتوب سیزدہم (مسئلۂ جبر و اختیار)، مکتوب چہاردہم (ہندو دھرم اور اس کے آئین)، مکتوب ہفدہم (حضرت معاویہؓ سے متعلق اہل سنت وجماعت کا عقیدہ)، مکتوب بیست ویکم (التزام اتباع سنت سنیہ)، مکتوب بیست وسوم (مسئلہ وحدت وجود)۔

بعض مکتوبات علمی و اعتقادی حیثیت سے خاصے دلچسپ ہیں۔ ان سے میرزا صاحب کے فضل وکمال علمی کے علاوہ ان کے نقطۂ نگاہ اور وسعت مشرب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کا سب سے دل چسپ اور اہم وہ مکتوب ہے جس میں انھوں نے ہندوؤں کے آئین و اعتقاد پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً ان کے اصول عقاید اور فروع اعمال کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

"آنچہ از کتب قدیمۂ اہل ہند معلوم می شود اینست کہ رحمت الہیہ در وقت آغاز پیدایش نوع انسانی برای اصلاح معاش و معاد شان کتابی مسمّٰی بہ بید کہ چہار دفتر دارد مشتمل بر احکام امر و نہی و اخبار ماضی و مستقبل بتوسط ملکی برہما نام کہ آلۂ و جارحۂ ایجاد عالم است فرستاد و مجتہدان اینہا از آں کتاب شش مذاہب استخراج نمودہ بنای اصول عقاید را برآں گذاشتہ ایں فن را دھرم شاستر نامیدہ اند یعنی فن ایمانیات کہ علم کلام باشد و افراد نوع انسانی را چہار فرقہ مقرر نمودہ و چہار مسلک از آں کتاب برآوردہ برای ہر فرقہ مسلکی قرار دادہ بنای فروع اعمال را برآں نہادہ ایں فن را کرم شاستر خواندہ یعنی فن عملیات کہ علم فقہ باشد"[1]

میرزا صاحب ہندوؤں کو مشرک نہیں سمجھتے کیونکہ ان کی رائے میں تمام ہندو فرقے توحید

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہاردہم، ص ۲۶۔

کے قائل ہیں، عالم کو حادث اور مخلوق خداوندی مانتے اور حشر و نشر پر ایمان رکھتے ہیں[۱]۔ ان کی بت پرستی کے بارے میں میرزا صاحب کی رائے ہے کہ وہ الوہیت میں شرک نہیں ہے بلکہ،

تحقیقت بت پرستی اینہا آنست کہ بعض ملائکہ کہ بامر الٰہی در عالم کون و فساد تصرفی دارند یا بعض ارواح کاملاں کہ بعد ترک تعلق اجساد آنہا ادریں نشاء تصرفی باقیست یا بعض افراد احیا کہ بزعم اینہا مثل حضرت خضر علیہ السلام زندۂ جاوید اند صور آنہا ساختہ متوجہ باں می شوند و بسبب ایں توجہ بعد مدتی مناسبتی بصاحب آں صورت بہم می رسانند و بنا بر آں مناسبت حوائج معاشی و معادی خود را ادا می سازند وایں عمل مشابہتی بذکر رابطہ دارد کہ معمول صوفیۂ اسلامیہ است کہ صورت پیر را تصور می کنند و فیضہا بر می دارند ایں قدر فرق است کہ در ظاہر صورت شیخ نمی تراشند[۲]۔

ان کی رائے میں ہندوؤں اور کفار عرب میں بیّن فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ "آنہا (کفار عرب) بتان را متصرف و مؤثر بالذات می گفتند نہ آلۂ تصرف الٰہی و اینہا را خدای زمین می دانند و خدای تعالیٰ را خدای آسمان وایں شرک است در الوہیت و سجدۂ اینہا (ہندوہا) سجدۂ تحیت است نہ سجدۂ عبودیت[۳]۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ہندو دھرم کو دین منسوخ مانتے ہیں، "قواعد و ضوابط دین اینہا نظم و نسق تمام دارد۔ پس معلوم شد کہ دین مرتبی بودہ است و منسوخ شدہ[۴]۔"

جب ہندو دھرم کو ایک دین تسلیم کر لیا گیا تو ہند میں بعثت انبیا لازم قرار پائی۔ اس سلسلہ میں میرزا صاحب لکھتے ہیں کہ:

---

[۱] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہاردہم، ص ۲۶ [۲] ایضاً ص ۲۷، [۳] ایضاً ص ۲۷، [۴] ایضاً ص ۲۶،

"بحکم آیۂ کریمہ وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر، وآیۂ کریمہ ولکل امۃ رسول
وآیات دیگر در ممالک ہند نیز بعثت انبیا و رسل واقع شدہ است واحوال آنہا در کتب
اینہا مضبوط است واز آثار آنہا کہ باقی است ظاہر می شود کہ مرتبۂ کمال وتکمیل داشتہ
اند و رحمت عامہ رعایت مصالح عباد را دریں مملکت وسیع فرو نگذاشتہ[1]"

یہاں میرزا صاحب کے ایک مرید شاہ غلام علی کا بیان کیا ہوا ایک واقعہ نقل کر دینا دل چسپی و افادہ سے خالی نہ ہوگا، وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن میرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک روز ایک شخص نے حضرت حاجی محمد افضل سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک صحرا ہے جس میں آگ جل رہی ہے اور کرشن اس آگ میں ہیں اور رام چندر کنارے پر کھڑے ہیں، حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ کرشن و رام کافر ہیں اس لئے دوزخ کی آگ میں جل رہے ہیں، میں (میرزا مظہر) نے کہا کہ اس خواب کی یہ تعبیر نہیں، گذرے ہوئے لوگوں پر بغیر اس کے کہ شرع سے کفر ثابت ہو کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، ان دونوں اشخاص کے حالات سے کتاب وسنت ساکت ہیں، اور آیۂ شریفہ وان من قریۃ الا خلا فیھا نذیر کے مطابق ظاہر ہے کہ اس جماعت (ہنود) میں بھی بشیر و نذیر گذرے ہوں گے، اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں حضرات ولی یا نبی رہے ہوں، رام چندر چونکہ ابتدائی عہد میں دنیا میں آئے جب کہ لوگوں کی عمریں دراز اور طاقت و توانائی زیادہ ہوتی تھی، اس لئے انھوں نے لوگوں کی تربیت سلوک کے طریقہ کے مطابق کی، کرشن ان بزرگان دین کی آخری کڑی ہیں اور اس وقت دنیا میں تشریف لائے جب عمر کوتاہ اور قوت ضعیف ہو چکی تھی، اس لئے انھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی تربیت جذب کے مطابق کی، ان سے

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب چہاردہم، ص ۲۶۔

متعلق غنا و سماع کی جو روایتیں مشہور ہیں، وہ ان کے اسی جذب و مستی اور ذوق و شوق کا ثبوت ہیں، چنانچہ اس خواب میں عشق و محبت کی حرارت نے صحرائے آتش کی شکل اختیار کی، کرشن چونکہ کیفیات عشق میں ڈوبے ہوئے تھے، اس لئے آگ کے اندر دکھائی دئے اور رام نے چونکہ راہ سلوک اختیار کی تھی اس لئے کنارے پر نظر آئے،[1]

لیکن چونکہ ہندو دھرم دین منسوخ ہے اس لئے اب اس پر عمل نہیں ہو سکتا، چنانچہ میرزا صاحب نے اس خیال سے کہ غلط فہمی نہ ہو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "بعد ظہور پیغمبر ما کہ خاتم المرسلین است صلی اللہ علیہ وسلم و مبعوث است بکافۂ انام و دین او ناسخ ادیان است، شرقاً و غرباً احدی را تا انقراض زمان و مجال عدم انقیاد وی نماندہ پس از آغاز بعثت او تا امروز کہ یک ہزار و صد و ہشتاد سال است ہر کہ باوی نگر دیدہ کافر است و بے یقینان"[2]

آواگون یا تناسخ ہندو مذہب کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، ہمارے یہاں اس عقیدہ پر کامل طور سے غور کئے بغیر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کا ماننا کفر ہے، لیکن میرزا صاحب کی اس عقیدہ سے متعلق یہ رائے ہے کہ "اعتقاد تناسخ مستلزم کفر نیست"[3]

میرزا صاحب خرق عادات کو "منظور عوام" کہتے ہیں اور باجماع صوفیہ اسے نہ شرائط ولایت میں داخل سمجھتے ہیں اور نہ اس کے لوازم میں[4] اس کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ "صحابہ کرام کہ افضل از جمیع افراد امت مرحومہ اند کمتر مصدر ایں امور گشتہ"[5]

ملفوظات میں بھی ہے کہ "ظہور خرق عادات شرط علو کمالات نیست، اصحاب کرام

---

[1] شاہ غلام علی، مقامات مظہری، ص ۲۳ [2] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب مکتوب چہاردہم، ص ۲۷، [3] ایضاً [4] ایضاً مکتوب دوم ص ۱۳ [5] ایضاً،

رضی اللہ تعالیٰ عنہم باوجود علو درجات کہ ہیچ ولی بآں نتواند رسید، مصدر کثرت خوارق عادات ونسبتہای شوق وذوق وجذب واستغراق نبودند[۱]"

لیکن خرق عادات کو وہ ناممکن بھی نہیں سمجھتے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "ہیچ کمالی غیر از نبوت بالاصالۃ ختم نگردیدہ و در مبداء فیاض بخل و دریغ ممکن نیست[۲]" مگر کرامت پر استقامت کو ترجیح دیتے ہیں، "مراد از ظہور آثار کمال اگر استقامت است کہ فوق کرامت است[۳]"

اسی طرح صوفی کامل کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ "صوفی کامل خیر و کمال را اصلاً بخود منسوب نمی نماید و مستعار می داند[۴]" کیونکہ "نظر صوفی بر مظاہر شریفہ و خسیسہ بر جہت وجود کہ در آں مظاہر است و مصدر خیر شدہ است می افتد وچوں در خود نظر می کند نگاہ او بر جہت عدم کہ ذاتی اوست و منشاء شر است خواہد افتاد و خود را از خیر و کمال مطلقاً عاری خواہد دید و خیر کمال عاریتی را کہ از جہت وجود کسب کردہ از آں خود نخواہد یافت[۵]"

مسئلۂ سماع صوفیہ و سالکین کا بڑا محبوب و دلچسپ موضوع ہے، میرزا صاحب کے کسی معتقد نے اس مسئلہ کو بھی چھیڑا تھا، انھوں نے اس کا جواب کسی قدر تفصیل سے دیا ہے، وہ لکھتے ہیں "در مسئلۂ سماع درمیان ائمۂ فقہا و حضرات صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اختلاف قوی است، فرقۂ اولیٰ می گویند کہ سماع مطلقاً حرام است ...... فرقۂ ثانیہ می فرمایند کہ باطلاق حلال است[۶]"

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ سماع کی دو قسمیں ہیں اور پھر ان دونوں قسموں کی تعریف و وضاحت کرتے ہیں؛

"سماع بر دو قسم است، یکی آنکہ شخصی کہ محل فتنہ نباشد کلامی موزون بہ لحنی موزون بی

---

[۱] کلمات طیبات، ملفوظات میرزا صاحب، ص ۹، [۲] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب دوم ص ۱۳، [۳] ایضاً ص ۱۳ [۴] ایضاً مکتوب نہم ص ۲۱ [۵] ایضاً، ص ۲۱ [۶] ایضاً مکتوب دوازدہم ص ۲۳۔

مداخلت معذور شرعی انشاد نماید و فسادی از آں در باطن مستمعین نزاید بلکہ سروری یا حزنی در قلب پدید آید۔ این قسم سماع البتہ مباح است کہ مرکب از دو امر مباح کہ کلام موزوں و نشید موزوں باشد ... قسم دوم آنست کہ غالیان متأخرین رواج دادہ اند و آں را بجد گرفتہ و امور غیر مشروعہ را دراں خلط نمودہ اند، این قسم بقدر مداخلت امور غیر مباح از کراہت بحرمت خواہد رسید و آنکہ جماعتی از ارباب کمال رغبت بہ سماع مباح نیز ندارند از خصوصیات ذوقی است نہ از احکام شرعی"[1]

اس سلسلے میں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس بارے میں خود میرزا صاحب کا طرز عمل کیا تھا۔ مسئلۂ سماع کے متعلق سب کچھ کہہ لینے کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ "فقیر از سماع غیر مباح تائب و سماع مباح را تارک است و در عقیدۂ اباحت و غیر اباحت آں تابع کتاب و سنت است"[2]

مسئلۂ جبر و اختیار علما و حکما کا بڑا اہم موضوع بحث رہا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق میرزا صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ علمانے اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ابھی اولاد آدم کی تشویش خاطر باقی ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "عقل در ادراک بعض مقدمات دینی کافی نیست"[3] اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ "وگرنہ در اصلاح امور عباد حاجت بہ نزول نبی افتاد"[4]

اس کے بعد وہ جبر و اختیار کا مفہوم سمجھاتے ہیں، ان کے سمجھانے کا انداز بہت سنجیدہ اور منطقی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ،

"باید دانست کہ ادعای اختیار مستقل و جبر محض ہر دو مستلزم انکار کتاب و سنت است زیراکہ اعمال عباد مثل اعیان اینہا بحکم نص جلی مخلوق اوست سبحانہ و تعالیٰ، پس

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب دوازدہم ص ۲۴ [2] ایضاً ص ۲۴ [3] ایضاً مکتوب سیزدہم ص ۲۵ [4] ایضاً ص ۲۵۔

اختیار تام کجا؟ ونیز مواخذہ از مجبور صرف ظلم است وظلم بحکم شرع مسلوب است از جناب او تعالیٰ شانہ. پس جبر محض چرا؟ بدیہی است کہ افعال ما مثل حرکات مرتعش نیست بلکہ مسبوق بعلم و ارادہ و قدرت وہمیت حصۂ اختیار و معنیٔ فعل اختیاری لیکن ظہور ایں سہ قوت باختیار ما نیست، ہرگاہ می خواہند از مبدا فیض می کنند وہمیں ست حصۂ جبر و معنیٔ فعل اضطراری وچوں اختیار تام وجبر محض متحقق نہ شد پس امر لیست متوسط.... امر متوسط بلسان شرع معتبر است بلفظ کسب وایں لفظ را جز برفعل عباد اطلاق نمی کنند. پس معلوم شد کہ افعال ما مخلوط جبر و اختیار است[1]

مسئلۂ جبر و اختیار کے متعلق میرزا صاحب کا یہ ارشاد علمی نقطۂ نگاہ سے تھا، آگے چل کر وہ اس مسئلہ پر صوفیانہ نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالتے ہیں:

"برطور صوفیہ ثبوت حصۂ اختیار بدیں وجہ می تواں کرد کہ نزد ایشاں ظہور حضرت وجود در ہر ذرہ از ذرات کائنات بتمامہ است... وچوں اختیار نیز صفتی وشانے است از صفات وشیونات حضرت وجود پس باید کہ در مظہری از مظاہر خصوصاً در انسان کہ مشرف است بمنصب خلافت حصہ از صفات اختیار ہم متحقق باشد وبنای تکلیف امر ونہی بر آں بود"[2]

حضرت امیر معاویہؓ کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے ان کی ذات مسلمانوں کے دو گروہوں میں باعث نزاع بنی ہوئی ہے، میرزا مظہرؒ اس جماعت کے نمایندہ ہیں جو حضرت معاویہؓ کو جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، زیادہ قصوروار نہیں سمجھتی اور ایک صحابی کی حیثیت سے وہ جس احترام کے مستحق ہیں اس کا بجالانا ضروری سمجھتے ہیں، اس سلسلے میں

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بستم، ص ۲۵ [2] ایضاً ص ۲۵۔

انھوں نے مفصل طور سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس خیال سے کہ ناظرین کو تفصیلی طور پر معلوم ہو جائے کہ ان کا طریقۂ فکر کیا تھا۔ اس خط کو مکمل یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"علمای مذہب اہل سنت متنازعات حضرات صحابہ را بنا بر حسن ظن کہ در شان خیر القرون لازم است تاویل می کنند و اگر قابل تاویل نباشد تفویض بجناب الہی می نمایند و جرأت بذم وطعن ممنوع می دانند چرا کہ در قرون ثلثہ مشہود بالخیر ہیچ یکی از علما و محدثین و مجتہدین باوجود قرب زمان و اطلاع تام بر احوال ایشاں و باوجود اقرار نسبت خطا بمخالفان حضرت علی مرتضی علیہ السلام تجویز طعن بر ایشاں نکردہ و اگر چند روز میان لشکر شام و لشکر کوفہ محاربہ و ملاعنہ واقع شدہ از شدت تعصب بودہ نہ بنا بر عقیدۂ کفر ہم دیگر و مادۂ تعصب در کتب معتبرہ مذکور است و مبدا آیں فتنہ شہادت امیر المومنین عثمان است رضی اللہ عنہ وطریقۂ اسلم ہمنیست زیرا کہ در وقت نزاع عسکرین حضرات صحابہ سہ فرقہ شدہ بودند جماعتی جانب خلیفہ برحق علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ گرفتند و جماعت دوم بطرف امیر شام رفتند و فرقۂ سوم توقف نمودند و شک نیست کہ محدثان و مجتہدان آں قرون در اخذ حدیث بر مرویات ہر سہ فرقہ وثوق مساوی داشتند۔ اگر احدی را ازیں سہ فرقۂ ثلثہ مطعون بکفر و فسق می دانستند قبول روایات از آں فرقہ نمی کردند و بنای اجتہاد و استنباط بر آں نمی گذاشتند و اگر طعن در شان آنہا روا دارند ملت دین اسلام برہم می خورد۔ پس در کف لسان از مطاعن آنہا حکمت دینی ست و حرمت صحبت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام علاوہ آں۔ و اگر مخالفان گویند کہ حفظ حرمت و رعایت قرابت آنحضرت ضرورتر است قبول داریم۔ لیکن از اہل قرابت تصریح بہ تکفیر متنازعان ثابت نیست و وحشت و نفرت خود لازم نزاع است مع ہذا صدور ایں چنیں خطا از

اہل خیر القرون خیلی مستبعد و مستکرہ است، اگرچہ آں خطا خطای اجتہادی باشد کہ مودت ذوی القربای آنحضرت واجب است بر جمیع افراد امت و اگر استکراہ نیز درمیان نباشد رضا باذیت اہل قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لازم می آید دیگر بحث ازیں مسئلہ مناسب نیست . . . فرقۂ شیعہ چوں از مسلک اعتدال انحراف ورزیدہ اند اعتماد بر اخبار بی اصل کردہ و آں نفوس زکیہ را بر نفوس خبیثۂ خود قیاس نمودند رفتہ رفتہ بہ تکفیر اصحاب کہ مبدأ آثار خیر نبوت و ناقلان کتاب و سنت اند مبتلا گردیدند و نہ فہمیدند کہ پیغمبری کہ حق تعالیٰ نبوت بر وختم کردہ و بکافۂ انام مبعوث ساختہ و دین وناسخ ادیان و باقی تا انقراض زمان است وما ارسلناک الا رحمۃ للعٰلمین نازل درشان او جماعت کہ در طول عہد نبوت او صحبت با و داشتہ باشند و دقیقہ از بذل ارواح و اموال در خدمت او تا حیات او در ترویج شریعت او بعد ممات او فرو نگذاشتہ بدستگیری او از ورطۂ کفر ہم نرستند و بہ ساحل نجات نہ پیوستند طرفہ حسن ظنی بخدا و رسول دارند، خدا نخواستہ اگر حقیقت کار ایں چنیں باشد کما زعموا فی شانِ السابقین پس لاحقین را از چنیں خدا چہ امید رحمت است و از چناں پیغمبری چہ توقع شفاعت احوال پیغمبرانِ سابق و امم ایشاں پوشیدہ نیست و واقعات اولیای ایں امت نیز پنہاں نہ، ہرگز ندیدہ و نشنیدہ کہ بعد از ارتحال یکی ازیں بزرگان ہمہ مخلصان او مرتد و منکر گردیدہ و با اولاد و آل او عداوت ورزیدہ باشند دریں صورت بر بعثت پیغمبر کہ مقصود از آں اصلاح امت است کدام فائدہ مترتب شد و نیز بایں حساب خیر القرون شر القرون می گردد و خیر الامم شر الامم می شود خدا انصاف نصیب کند[1]

---

[1] کلمات طیبات مکتوبات میرزا صاحب، المکتوب ہفدہم، ص ۳۰

تصوفانہ اور علمی و مذہبی مباحث کے علاوہ مکاتیب کے ذریعہ جیسا کہ سلسلۂ حالات میں لکھا گیا ہے، میرزا صاحب نے ارشاد و ہدایت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں، مختلف اوقات میں مختلف مریدوں کو ہدایتیں کی ہیں، مشورے دیئے ہیں، تنبیہیں کی ہیں، اس کی چند مثالیں حالات زندگی کے باب میں دی جا چکی ہیں، یہاں ان میں سے بعض کا اعادہ اور چند مزید مثالوں کا اضافہ نامناسب نہ ہوگا،

ایک مکتوب میں مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو لکھتے ہیں کہ،

"بخاطر جمع بکار خود ساعی و سرگرم باید بود و تشویش را در باطن خود راہ نباید داد و اوقات را در ایصال منافع دینی ظاہراً و باطناً مصروف دارید کہ او سبحانہ شمارا دولتی لا دادہ است ... در تعلیم طریقہ و درس کتب مقید باشید و ختم خواجہا رضی اللہ تعالیٰ عنہم و ختم حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر روز بعد حلقۂ صبح لازم گیرید و بجناب او امید دارد و عزاز د نومید باشید"[1]

ایک اور مرید کو نصیحت کرتے ہیں کہ "شما بالتزام شریعت و شغل طریقت مقید باشید و بمردم بخاکساری و بی نفسی معاملہ نمائید کہ کمال نفس و نیستی است و ہستی حق تعالیٰ را مسلم است و صحبت علماء و فقراء لازم گیرید و بر مکروہات زمانہ صبر گزینید ... ہر جا باشید با خدا باشید و بر محبت پیران طریقت باشید"[2]

ایک مرید کو تنبیہ کرتے ہیں: "فقیر در معاملہ معلوم کردم کہ والدۂ شما در باطن ناخوش اند ناخوشی والدہ موجب خسارت دنیا و آخرت است، خصوصاً والدۂ مشفقہ۔ ایں معنی را استغفا نمودہ اگر اصلی داشتہ باشد کفارت و مکافات بعمل آرند۔ اللہ تعالیٰ عواقب امور شان مقرون

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب بست و ہشتم، ص ۴۱ [2] ایضاً مکتوب سی و دوم ص ۴۳

بخیر گرداند۔[۱]

اسی طرح اپنے محبوب و ممتاز مرید قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے فرزند اصغر مولوی احمد اللہ کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ

"معلوم شد کہ ارادۂ حج کردہ اید از دین داری ظاہر و نسبت باطن بعید نمود کہ باوجود عدم فرصت حج حقوق والدین و اتلاف حق زوجہ کہ بہ چندیں غم و الم مبتلا است اختیار کردن و مرتکب کبائر برای ادای مستحبی گردیدن از مثل شما با کمال مستبعد است باید کہ برکروہات زمانہ صبر نمودہ مانند ارباب مقامات عالیہ رضا بقضا را کار فرمودہ ایں خطرہ را از دل برآرید کہ فقیر را آزار بسیار بدل خواہد رسید و آزار درویشان ذی حق خوب نیست، باخدا مشغول باید بود کہ بقطع نظر از فائدہ اجر سعادت اخروی راحت دنیوی نیز در ایں است۔"[۲]

ایک مرید کو جن کا شہر سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے، سورۂ لایلاف کی تلاوت کی تلقین کرتے ہیں "تلاوت سورۂ لایلاف صبح و شام لازم گیرند و ہمہ دوستان و متوسلان را بفرمایند۔"[۳]

ایک مرید کو دعائے حزب البحر کے ورد کی اجازت دیتے ہیں "وقت کشف کرب قریب است حزب البحر خود پیش ایشاں خواہد بود اجازت است برای حل مشکلات بخوانند و طور خواندن آں حضرت میر سلمان صاحب سند کنند۔"[۴]

ایک مریدہ کو نصیحت کرتے ہیں:

"اگر با بزرگان با ادب و با خورداں بمہر و شفقت زندگی نمایند ہیچ کسی بدی باشمانی تواند کرد و در اطاعت و خدمت شوہر کہ فلاح دین و دنیا رضای او تعالیٰ موقوف بر آنست

---

[۱] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب سی و ہشتم ص ۴۹ [۲] مکتوب پنجاہ و سوم ص ۶۷ [۳] ایضاً مکتوب چہل و ششم ص ۵۰ [۴] ایضاً مکتوب چہلم ص ۴۸

باید کوشید و غضب و غصہ را باید خورد و زبان را از کلمات نالائق باز باید داشت و تقید در نماز ہم باید کرد ..... اگر مستورات توفیق یابند و از شما توجہ خواہند البتہ توجہ بدہید اجازت است۔ تاثیر خواہد شد[1]۔

مکاتیب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ میرزا صاحب بعض اوقات غائبانہ طور پر اپنے مریدوں کو توجہ دیتے تھے، مثلاً ایک مرید کو لکھتے ہیں "ہر صبح بعد نماز متوجہ بفقیر بنشنید، بی ناغہ توجہ می دہم، از کسی توجہ نگیرید[2]۔"

ایک دوسرے مرید کو اطمینان دلاتے ہیں کہ "بتاریسدن شما فقیر انشاء اللہ تعالیٰ بعد نماز یک دو گھڑی روز بر آمدہ بیش از حلقہ یا بعد آں بجانب مستورہ شما متوجہ خواہد شد[3]۔"

مکاتیب سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اپنے طریقے کی ترویج و اشاعت کے لئے دہلی سے باہر دوسرے علاقوں میں خصوصاً روہیل کھنڈ جایا کرتے تھے، اس سلسلے کے اقتباسات سلسلۂ حالات میں دیئے جا چکے ہیں۔

ان مکاتیب سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ میرزا صاحب کو اپنے مریدوں سے بڑی محبت تھی، اور وہ ان پر بہت شفقت فرماتے تھے، ان کے درد و دکھ سے متاثر ہوتے تھے، ان کی ترقی دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ان کی ہمت افزائی کرتے تھے، ان کی محبت و شفقت کی متعدد مثالیں سلسلۂ حالات میں دی گئی ہیں، پھر بھی یہاں چند مزید مثالوں کا اضافہ نامناسب نہ ہوگا۔

ایک مرید کو اس طرح تسلی دیتے ہیں "فقیر را از خود غافل ندانید، ہر روز ہر وقت دل متوجہ بشماست، حاجت تاکید نوشتن نیست۔ کس از جان خود غافل نمی باشد، من شما را برابر جان دوست می دارم، انشاء اللہ تعالیٰ محظوظ و محفوظ خواہید بود[4]۔"

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب ہشتاد و دوم ص ۷۰، [2] ایضاً مکتوب چہل و دوم ص ۴۹ [3] ایضاً مکتوب سی و ہفتم ص ۴۷، [4] ایضاً مکتوب سی و ششم ص ۴۶۔

ایک مرید سے اپنے خلوص و یگانگت اور محبت و شفقت کا اس طرح اظہار کرتے ہیں "خط شما رسید و از مضامین وحشت آئین گذشت بر من آنچہ گزشت، چوں غرض نفسانی نداریم و بنای عمل ما بر نیت صالحہ است صبر کردیم و از جا نرفتیم وگرنہ ایں بی اعتنائی کہ نواب با شما کردہ اند گوئی با فقیر است"

چند مریدوں کی ترقی پر اس طرح اظہار خوشنودی فرماتے ہیں "مردم محفل شما بالقاعدہ طغرہ تا ولایت کبریٰ خدای تعالیٰ رسانیدہ، طرفہ عفیفہ خوش استعدادی است و در عالم عقیدت واخلاص پیش دو مردان است، میر ممھو تا مبادی کمالات نبوت رسیدہ اند و میاں جگن قریب تمامی دائرۂ امکان و میر مبین خود شیخ مقرری است"[1]

ایک مرید کی تصنیف کا مسودہ دیکھ کر اس طرح اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں "مسودۂ رسالۂ تصوف بمعرفت مولوی غلام علی رسید و بمطالعۂ ایں مطالب و مسائل ارجمند مشرف شدہ از موہبت عظمیٰ و عطیات کبریٰ دانست و تحقیق بعد توضیح کجا یافتہ می شود و حظہا بر داشتم بارک اللہ فی برکاتکم، باید کہ رسائل صغیر و کبیر مصنفات خود در مجلدی جمع نمائید و تغافل نکنید"[2]

ایک مرید کے غم میں اس طرح شریک ہوتے ہیں "خبر ملامت اثر واقعۂ مرحومہ لطف النسا رسید، زہرہ را آب و دل را کباب گردانید، خدای تعالیٰ آں مرحومہ را بیامرزد، در برزخ توجہ کردہ الحمد للہ کہ شمول افضال و الطاف الہی است"[3]

نواب ارشاد خاں کی دائمی جدائی پر اس طرح اظہار غم کرتے ہیں "داغی بر دل گذاشتند کہ مرہمی ندارد"[4]

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب پنجاہ و ششم ص ۵۷ [2] ایضاً مکتوب پنجاہ و ششم ۶۵ [3] کلمات طیبات میرزا صاحب مکتوب ہفتاد و ششم ص ۶۷ [4] ایضاً مکتوب بست و ششم ص ۴۰،

میرزا صاحب نے بعض مکاتیب میں اپنے مریدوں اور دوستوں کی سفارشیں بھی کی ہیں، یہ سفارشیں دینی نقطۂ نگاہ سے بھی ہیں، اور دنیاوی لحاظ سے بھی، مثلاً ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ "میاں محمد اکبر از یاران طریقہ بتقریبی آنجامی رسند تا نصف دائرۂ امکان رسیدہ اند، اگر التماس توجہ از شما بکنند البتہ توجہ بدہند و در امور مرجوعۂ دنیوی ایشان نیز سعی نمایند و از کلمۃ الخیر تا مقدور دریغ نفرمایند"[۱]

ایک مرید فیض اللہ خاں بیمار ہیں، ایک دوسرے مرید کو لکھتے ہیں کہ "چوں سلب امراض قلب و قالب معمول حضرات ماست رضی اللہ تعالیٰ عنہم وحق تعالیٰ آنجناب را قوت و قدرت آں عطا کردہ است، چرا از راہ انکسار خود را دریں امر معذور دارند، فیض اللہ خاں صاحب را ہر روز پیش روشنا یندہ بقدر یا لضد نفس سلب مرض ایشاں نمایند تاکید است"[۲]

ایک مرید کی اس طرح سفارش کرتے ہیں "ہزبر علی خاں صاحب کہ بجای برادر و فرزند فقیر و از خاندان عمدہ و باوصاف حمیدہ متحلی اند بتقریبی قصد دہلی بھیت نمودہ اند، معرفتی با مردم آں بلدہ ندارند بوسیلۂ رقعۂ فقیر اگر بخدمت برسند مورد مراحم خواہند شد و اشفاق و عنایتی کہ بایشاں مبذول خواہد شد بعینہٖ عاید بفقیر خواہد گشت"[۳]

میرزا مظہرؒ کا زمانہ سیاسی و اقتصادی حیثیت سے بڑا پُر آشوب زمانہ تھا، جب انھوں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو وسیع و عظیم مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی، مرکز کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے ملک میں مختلف باغیانہ طاقتیں ابھر آئیں، دکن میں شورش برپا ہوئی، جاٹوں نے اودھم مچائی، سکھوں نے فساد کیا، روہیلوں نے بغاوت کی، مرہٹوں نے لشکر کشی کی،

---

[۱] کلمات طیبات، مکتوبات میرزا صاحب، مکتوب پنجاہ و یکم ص ۵۲ [۲] ایضاً مکتوب بیست و چہارم ص ۳۹ [۳] ایضاً مکتوب چہل و سوم ص ۴۹،

غرض سارے ملک میں اقتصادی بدحالی اور سیاسی بے چینی تھی، میرزا صاحب کے بعض مکتوبات میں ان ہنگامہ آرائیوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں، ان کے اقتباسات سلسلۂ حالات میں دیے جا چکے ہیں،

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میرزا صاحب کی طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان سے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے،

ان مکاتیب کا طرزِ تخاطب اس زمانے کے دستور کے برعکس نہایت سادہ و بے تکلف ہے، ان میں محمد شاہی عہد کی رنگینی و پرکاری اور تکلف و تصنع کا قطعی اثر نہیں پایا جاتا، میرزا صاحب اپنا کوئی خط القاب و آداب کے بغیر شروع نہیں کرتے تھے، لیکن وہ پُرتکلف القاب و آداب استعمال کرنے کے خلاف تھے، ان کے خطوط عموماً اس طرح شروع ہوتے ہیں:

(۱) بعد حمد و صلوٰۃ از فقیر جان جاناں مولوی ثناء اللہ صاحب سلمہ الرحمٰن مطالعہ نمایند،

(۲) بعد حمد و صلوٰۃ از فقیر جان جاناں مولوی احمد اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ دریابند،

(۳) حامداً و مصلیاً، از فقیر جان جاناں برخوردار ارین مرزا شاہ علی عافاہ الرحمٰن دریابند،

اللہ معکم اینما کنتم

الحمد للہ علیٰ نوالہ و سبحانہ تعالیٰ

الحمد للہ حمداً کثیراً

صرف ایک خط میں انھوں نے مندرجۂ ذیل القاب استعمال کئے ہیں،

نفسِ قدسی و شخصِ علوی، مہربان قدردان این ہیچکارہ وہیچمدان،

اسی طرح میرزا صاحب مکتوب کا خاتمہ بھی نہایت سادہ طریقے سے کرتے ہیں مثلاً:

والسلام، اللّٰھم اجعل خیر عمری آخرہ، مستفید ان مجلس شریف سلام قبول نمایند،

میرزا صاحب اپنا نام ہمیشہ شروع میں لکھتے تھے اور با لالتزام لکھتے تھے، خط کے خاتمے پر کبھی نہیں لکھتے تھے،

مکتوب کے آخری حصے میں وہ اپنے معتقدوں، مریدوں، دوستوں وغیرہ کو سلام یا دعا ضرور لکھتے تھے، بعض اوقات ناموں کی کثرت ہو جاتی تھی، یہ اس عہد کے خط نویسی کی ایک ادا تھی، مکاتیب کی ابتدا میں وہ تاریخ ضرور لکھتے تھے لیکن سنہ نہیں لکھتے تھے،

مکتوبات کی زبان صاف سادہ اور سلجھی ہوئی ہے اور انداز بیان میں سنجیدگی و متانت اور عالمانہ وقار پایا جاتا ہے، عبارت میں شستگی و روانی کے ساتھ سادگی و بے تکلفی ہے جو بجائے خود ایک حسن ہے، لیکن یہ خطوط ادبیت و انشا پردازی سے یکسر خالی بھی نہیں، مثلاً مندرجہ ذیل جملے انشا پردازی کا اچھا نمونہ کہے جا سکتے ہیں،

"سرمایۂ وجود فقیر در آغاز قطرۂ آبی و در انجام مشت خاکی است"

"التفات نامۂ سامی از مخدوم زادۂ گرامی بعد عمری رسید جان تازہ رسانید و باعث تجدید و تقویت نسبت اخلاص گردید"

"حامداً و مصلیاً و مسلماً حضرت میر صاحب مشفق من ہزاراں سال سلامت باشی کہ بعد مرگ و نومیدی بآب حیات نوید قدوم برکات لزوم دریں مرز و بوم ایں مردۂ صد سالہ را زندۂ جاوید ساختی"

"نواب ارشاد خاں مغفور رحلت نمودند آدمیت را بخاک بردند، خدا ایام زود تنہائی ما را تماشا باید کرد"

"انہماک در امور دنیا و منصب قضا بلائی است کہ راحت و حرمت شمار ابرباد دادہ، خدا حافظ آخرت است"

"فقیر ذلیل اللہ را بی اختیار دوست می دارد و عکس محبت او در مرأۃ قلب فقیر افتادہ، وگرنہ در باطن ہرگز نقشی از نقوش صفحۂ کائنات نمی نشیند۔"

کہیں کہیں اشعار کا استعمال بڑی عمدگی سے کیا ہے جس سے عبارت میں حسن اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے، قرآن مجید کی آیات بھی موقع و محل سے استعمال کی ہیں، اور اس سے بھی تحریر میں وزن اور حسن پیدا ہو گیا ہے،

بعض الفاظ اور ترکیبیں میرزا صاحب کے قلم سے ایسی نکل گئی ہیں، جنھیں فارسی کے اہل زبان شاید صحیح قرار نہ دیں، مثلاً،

ناخوش، ناخوشی	(ناراض اور ناراضگی کے معنوں میں)
فرصت	(اردو کے مفہوم میں)
تکلیف	(زحمت کے معنی میں)
معاف فرمائید یا کنید	(بجائے عفو کنید یا بخشید)
سلوک	(بجائے رفتار)
غصہ	(اردو کے مفہوم میں)
کلمات نالائق	(بجائے کلمات ناشائستہ یا نازیبا)
شادی	(بجائے عروسی)
سردی	(بجائے سرما)

اسی طرح دو ایک جگہ قواعد کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں، مثلاً

شش مذاہب، سہ برادران، والدات وغیرہ،

مخاطب کے لئے میرزا صاحب نے اکثر و بیشتر صیغۂ غائب استعمال کیا ہے:

ان مکاتیب کی قدر و قیمت حقیقت میں ان کے عالمانہ و تصوفانہ مضامین اور بے تکلف مگر سنجیدہ و متین انداز بیان کی وجہ سے ہے۔ اس لئے ان چند معمولی تسامحات سے قطع نظر کیا جا سکتا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ مذہبی اور تصوفانہ نقطۂ نگاہ سے کرنا چاہیئے۔

(۲)

بعض دوسری نثری تحریریں

مکاتیب کے علاوہ میرزا مظہرؒ کی مندرجۂ ذیل تحریریں ملتی ہیں:

(۱) رسالہ کلمات الحق مصنفہ سید غلام یحییٰؒ پر تقریظ،

(۲) دیوان فارسی کا دیباچہ

(۳) اپنے مختصر حالات آزاد بلگرامی کے تذکرۂ سرو آزاد کے لئے،

(۴) اپنے مختصر حالات بندرابن خوشگو کے تذکرۂ سفینۂ خوشگو کے لئے

(۵) وصیت نامہ

(۶) تنبیہات الخمسہ

(۷) سلوک طریقہ

پہلی تحریر بے حد مختصر ہے اور ادب و انشا کے لحاظ بھی اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی یہ حقیقت میں ایک عقیدت مند مرید سے اظہار خوشنودی کی سند ہے، یہ تقریظ کلمات طیبات میں میرزا صاحب کے سلسلۂ مکتوبات کے خاتمہ پر درج ہے،

دوسری تحریر یعنی دیوان فارسی کا دیباچہ مضمون اور انشا پردازی دونوں نقطۂ نگاہ سے اہم ہے، اس میں انھوں نے نہایت مختصر لیکن بلیغ انداز میں اپنی زندگی پر تبصرہ کیا ہے، اپنی شاعری کے اصل محرک کی نشان دہی کی ہے، اپنے کلام کی ترتیب و تدوین کا ذکر کیا ہے اور "ارباب نقل و کور سواداں" کے خطرہ سے بچنے کے لئے آگاہ کر دیا ہے کہ اس مجموعہ سے خارج اشعار کو مسترد سمجھا جائے، ادبی حیثیت سے بھی یہ دیباچہ فارسی نثر کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتا ہے، مثلاً مندرجہ ذیل جملے انشا کی تمام خصوصیات کے حامل ہیں،

"در سال شانزدہ از عمر بر روی این خاکسار غبار یتیمی نشست و در بیست مشت خاک خود را بدامان درویشاں بست، مدت سی سال بر در مدرسہ و خانقاہ جاروب کشید و ایام گزیدۂ عمر درین شغل شریف گذرانید، بحول اللہ و قوتہ، در طول مدت زندگی دست طلب بلوث دنیا نیالود و پای سعی درین راہ نفرسود، امروز کہ ہزار و صد و ہفتاد و ہشت است عمر بشصت رسیدہ از بیست سال بکنج عزلت آرمیدہ است و بامر حضرات مشائخ رضوان اللہ علیہم اجمعین بہ تصحیح نسخۂ وجود بی نوع مشغول است با آنکہ فرد باطل شخص او ہنوز ہزاراں غلط دارد۔"

تیسری تحریر بھی نفس مضمون اور انشا پردازی دونوں حیثیتوں سے اہمیت رکھتی ہے، اس میں میرزا صاحب نے نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اپنے حالات چند سطروں میں لکھے ہیں اور آخر میں اپنی کیفیت مزاج کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، چونکہ یہ مختصر حالات ایک صاحب تذکرہ کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں اس لئے اس میں اپنی شاعری کے اصل محرک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، یہ وہی محرک ہے جس کا ذکر فارسی دیوان کے دیباچہ میں ہو چکا ہے، انشا کے لحاظ سے مندرجہ ذیل جملے خصوصیت سے لائق اعتنا ہیں:

"این خاکسار از بدو طفلی ہوای مال و جاہش در سر نہ پیچید بعد تحصیل ضروریات این مشت غبار خود را بدامن دولت از خود رفتگان بستہ بامید آنکہ چشمی در عالم دیگر باز کند چون نقش قدم بر در ایشاں نشستہ است از بس دماغش ضعف قوی دارد تاب تدبیر اسباب نمی آرد تجرید و تفرید اختیار کردہ نان بر خوان کسی نخوردہ و چوں گل عمر خود را بیک خرقہ بسر بردہ بتحریک شور عشقی کہ نمک خمیر اوست گاہ لبی بفریاد وا می کند، چوں نالہ اش موزوں واقع می شود احباب از راہ جوہر شناسی بمیزان اشعارش می سنجند و گرنہ او از غایت انصاف نظر بہ بی سرمایگی خود دکانی بر سخن نچیدہ، زیادہ برین نیست کہ نظر بزرگان یافتہ حسن قبولی بہم رسانیدہ است، او سبحانہ حسن خاتمہ ہم نصیب کند"

چوتھی تحریر کو تیسری کا اختصار سمجھنا چاہیئے، پانچویں بھی مختصر ہے، باقی دو تحریریں نفسِ مضمون کے لحاظ سے اہم ہیں، زبان سادہ اور بے تکلف ہے، انداز بیان میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے، اور علمی وقار اور استدلال نے ان میں وزن پیدا کر دیا ہے،

مجموعی حیثیت سے میرزا صاحب کی عبارت میں بالعموم برجستگی، شگفتگی، اختصار اور جامعیت ہوتی ہے۔ وہ سادگی میں حسن پیدا کرتے ہیں اور یہ انشا پردازی کا ایک کمال ہے۔

(۴)

خاتمۂ سخن

میرزا جان جاناں مظہرؒ کی اہمیت تین حیثیتوں سے ہے، وہ صوفی تھے، فارسی اور اردو کے شاعر تھے، اردو زبان اور شاعری کے مصلح تھے، ایک صوفی کی حیثیت سے انھوں نے سیکڑوں ہزاروں، انسانوں کی زندگی بنائی، ان کے یہاں پیری، مریدی محض بیعت و شجرہ و کلاہ کے لئے نہ تھی بلکہ ان کا مقصد تعلیم ذکر قلبی، حصول جمعیت، اور توجہ الی اللہ تھا، انھوں نے اپنی کوششوں کو اپنی خانقاہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں رکھا بلکہ عام مسلمانوں کی بگڑی ہوئی مذہبی و معاشرتی حالت کی اصلاح کی سعی فرمائی، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ظلمت کدہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حق کی جو شمع روشن کی تھی اسی کی روشنی میں انھوں نے مسلمانوں کو رستہ چلنے کی تلقین کی، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی شمع رسالت سے لی تھی، اس طرح میرزا صاحب کا تصوف صحیح اسلامی تصوف تھا، بدعات سے یکسر پاک، ان کا جو قدم بھی اٹھتا تھا رسول پاک کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اٹھتا تھا، ان کا جو عمل بھی ہوتا تھا اتباع کتاب و سنت کی نیت سے ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے

انھیں اپنے عہد کا جادۂ شریعت و طریقت کا بہترین راہرو اور کتاب و سنت کا بہترین پیرو مانا ہے اور اپنے مکاتیب میں انھیں "قیم طریقۂ احمدیہ" اور "داعیِ سنتِ نبویہ" کے القاب سے یاد کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ جو خود ایک بلند مرتبہ صوفی ہیں، میرزا صاحب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ "در اوقات مرجوِ دعای سلامت از آفات ظاہری و باطنی در حق بندۂ ضعیف و فرزندان و متعلقان بوجود آمدہ باشد"[1]

کہا جاتا ہے کہ میرزا صاحب سے کرامات بھی ظاہر ہوئیں، لیکن وہ خود خوارق کو علوِ کمالات کی شرط قرار نہیں دیتے، ان کی رائے میں علوِ کمالات کی پہلی اور آخری شرط کتاب و سنت کی کامل پیروی ہے، یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا، یہی ان کی تعلیم و ہدایت کا ماحصل تھا، وہ اقبال کی زبان میں اس بات کے قائل تھے کہ،

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

انھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو اپنی سعیِ عمل سے مسلمان بنایا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری زبان کے مشہور محقق حافظ محمود خاں شیرانی کے الفاظ میں "بارھویں صدی ہجری کے ان مشاہیر میں سے ہیں جو آفتاب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں"[2]

میرزا صاحب کے فارسی کلام کی خصوصیات اوپر الگ الگ پیش کی جا چکی ہیں، مجموعی حیثیت سے ان کے کلام کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پاکیزہ اور لطیف خیالات کا حامل ہے، ان کے یہاں وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ عشق کی صحیح اور عمدہ عکاسی ملتی ہے، ان کے یہاں کیفیاتِ عشق کی مصوری ہے، لیکن تصوف کے زیرِ اثر ان کا کلام بوس و کنار سے پاک ہے، تصوف

---

[1] کلمات طیبات، مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ ص ۱۵۹ [2] اورینٹل کالج میگزین (لاہور) جلد ۱۸ عدد ۱ (نومبر ۱۹۴۱ء)

میں عشقِ حقیقی کا ذکر ہوتا ہے، اور عشقِ حقیقی کو ان باتوں سے واسطہ نہیں۔ ان کے جذبات میں خلوص ہے اور الفاظ میں تاثیر۔ ان کے یہاں عشق کی مجبوریاں ضرور پائی جاتی ہیں مگر یاس و حرمان کا ان کے یہاں گذر نہیں۔ ان کے یہاں سنجیدگی و متانت ہے، وقار ہے، توازن ہے۔ توازن اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے اور شاعر کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ ایک صوفی کی حیثیت سے وہ دنیا کو ایک خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن ان کا کلام زندگی سے گریز نہیں سکھاتا بلکہ عالی حوصلگی اور استغنا و بے نیازی کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کا شیوۂ تسلیم و رضا احساسِ پستی نہیں بلکہ جذبۂ نیازمندی و فدائیت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ عشق کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ان کا اسلوب شگفتہ و جاندار ہے۔ ان کے کلام کی پاکیزگی، خیالات کی لطافت اور اسلوب کی شگفتگی میں ان کے تنقیدی شعور کو بڑا دخل ہے، اسی تنقیدی شعور نے انھیں بیدل، ناصر علی وغیرہ کی نکتہ آفرینی سے محفوظ رکھا اور اسی کی بدولت ان کے کلام میں وہ رفعت و رعنائی پیدا ہوئی جو ان کی عظمت کا باعث ہوئی، اور جو فارسی شاعری کی تاریخ میں ان کے نام کو زندہ رکھے گی۔

میرزا صاحب کا اردو کلام بھی انہی خصوصیات کا حامل ہے جن کے لیے ان کا فارسی کلام ممتاز ہے۔ انھوں نے فارسی میں زیادہ کہا، فارسی کلام کو محفوظ رکھا، دیوان مرتب کیا، فارسی اشعار کا ایک نہایت عمدہ انتخاب تیار کیا۔ لیکن وہ اردو سے غافل نہیں رہے اگر انھوں نے اردو میں کم کہا (موجودہ اردو کلام کے پیشِ نظر) تو اسکی تلافی اس طرح کی کہ متعدد شاگردوں اور دوستوں کی تربیت کی اور صاحب تذکرۂ مسرت افزا کے الفاظ میں "شاگرد انش در فنِ سخن بمرتبۂ استادی رسیدہ دیا رانش از فیضِ صحبت وی در زبان دانی مستند خاص و عام گردیدند"[1]

وہ اردو شاعری کے پہلے مصلح ہیں۔ انھوں نے یہ اصلاح لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے کی ہے۔ ہم مقدمہ میں لکھ آئے ہیں کہ محمد شاہی عہد کے شعرا میں ایہام گوئی کا بڑا چرچا تھا۔ اس

[1] ابوالحسن امیر احمد: تذکرۂ مسرت افزا بحوالۂ رسالہ معاصر (پٹنہ) جلد ۲ حصہ ۷

صنعت کی بنیاد چونکہ تصنع پر ہے اس لیے اردو شاعری شعوب بے کیف ہو کر رہ گئی تھی، میرزا صاحب پہلے شاعر تھے جنھیں اس بات کا احساس ہوا، انھوں نے اردو شاعری کو ایہام کے خارزار سے نکالا اور لطافت خیال اور اسلوب بیان کے پھولوں سے اسے زینت دی، نیاز فتح پوری کی یہ رائے صحیح ہے کہ "ان کی خدمات نہ صرف اس لیے وزنی ہیں کہ انھوں نے اردو زبان کی تہذیب و شائستگی میں حصہ لیا بلکہ حقیقی رنگ تغزل کے معیار کو بہت بلند کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے"[1]

انہی کی کوششوں سے برج بھاشا اور دکنی الفاظ کا استعمال بہت کم ہو گیا اور بہت سے الفاظ متروک قرار پائے، عربی و فارسی کے الفاظ جو اردو میں صوتی لحاظ سے لکھے جاتے تھے، اب اپنی اصلی شکل میں لکھے جانے لگے، ان کی کوشش کا اثر مستقل اور پائدار تھا، ان کے تمام معاصرین نے ان کا اثر قبول کیا، اصلاح کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، آخر ناسخ کے عہد میں دکنی الفاظ متروک ہو گئے اور زبان منجھ کر صاف ستھری اور پاکیزہ ہو گئی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی رائے سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ میرزا مظہر اگر اس وقت یہ تحریک نہ پھیلاتے تو آج اردو زبان غالباً یہ نہ ہوتی اس میں اس وقت یہ عبارت لکھی جا رہی ہے"[2]

ان کے اصلاحی کارناموں کو اردو شاعری کا مؤرخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا، انہی کارناموں کے پیش نظر ہماری زبان و ادب کے بلند پایہ محقق و نقاد حافظ محمود خاں شیرانی نے یہ فیصلہ کیا کہ "ان کا پایہ میر و میرزا ..... سے بلند ہے"[3]

میرزا مظہر کے لطیف اشعار اور اصلاحی کوششوں نے انھیں اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رکھا ہے اور ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

---

[1] نیاز فتح پوری، انتقادیات، جلد دوم ص ۱۶۷

[2] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات ص ۱۲۳ اورینٹل کالج میگزین جلد ۱۸ عدد ۱ (نومبر ۱۹۴۱ء)

باقیاتِ مظہرؔ

(۱)

میرزا مظہرؔ کے یہ اشعار ہم نے مختلف مطبوعہ اور قلمی تذکروں اور بیاضوں سے جمع کئے ہیں، حاشیہ میں ہر شعر کا ماخذ بتا دیا گیا ہے، مختلف تذکروں اور بیاضوں میں بہت سے اشعار کی مختلف قرأتیں پائی جاتی ہیں، ہم نے حاشیہ میں اختلافات ظاہر کر دیئے ہیں، ماخذ بتانے اور اختلافات ظاہر کرنے میں مندرجۂ ذیل مخففات استعمال ظاہر کئے گئے ہیں،

ن	نکات الشعراء	ش	تذکرۂ شعراء
ت	تحفۃ الشعراء	گ ا	گلزار ابراہیم
ت ر	تذکرۂ ریختہ گویاں	ط س	طبقات سخن
گ گ	گلشن گفتار	ت ہ	تذکرۂ ہندی
م ن	مخزن نکات	م ا	مجموعہ انتخاب
ر	ریاض حسنی	ع	عیار الشعراء
چ	چمنستان شعراء	ع م	عیار منتخبہ
ط	طبقات الشعراء	ت ش	تذکرۂ عشقی

تش	تذکرہ شعرائے اُردو	م، ن	مجموعۂ نغز
گ س	گلشنِ سخن	گ ب	گلشنِ بیخار
ت م	تذکرۂ مسرت افزا	خ	تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا،
طش	طبقات شعرائے اردو	ب ج	بیاض کتبخانہ جامع مسجد بمبئی،
گ ہ	گلشنِ ہمیشہ بہار	م ش	مجمع الاشعار
س	سخن شعراء		(کتبخانۂ سالار جنگ)
طک	طور کلیم	م ک	مجموعۂ کلام شعرائے قدیم (،،)
ا	آبِ حیات	ک ل	کشکول (،،)
ب	بیاض پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی	ب ض	بیاض نمبر ۶۳۵ (،،)
		ب س	،، ،، ۶۱۳ (،،)
ب ا	بیاض احسن مارہروی مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	م ر	مرقع شعراء مرتبہ (رام بابو سکسینہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱)

(۱) گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

(۲) ہماری ہاتھ سے یہ دل کبھی بھاگا لے کے جاں اپنا — ہم اس کو جانتے تھے دوست اپنا مہرباں اپنا

---

(۱) گ م، ر، چ، ط، ح، ش، گ، س، م ن، ع، ا، م ش، م ک، ب، ض، م، ر

(ٹ م: چلے ہم گل کے ہاتھوں سے جلا کر خانماں اپنا

ط: چلی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا — ح م، ر: چلی اب گل کے ہاتھوں سے جلا کر آشیاں اپنا

م ن:- چلی یہ گل کے ہاتھوں سے جلا کر آشیاں اپنا

ع: چلی بلبل جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا — نہ چھوڑا حیف ہے اون نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

ا: چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا

م ش: وو کھیاری ہجر کی آتش سے جل کر خاک ہو گئی — نہ چھوڑی ہائے بلبل نے چمن میں آشیاں اپنا

ٹ ر گ، س:- اپناں ٹ ط: چمن میں ہائے بلبل نے نہ چھوڑا کچھ نشاں اپنا،

(۲) گ، ت، ر، چ، ش، م ن [ٹ ت: ہمارے ہاتھ سے بھاگا ہے دل لے جان جاں اپنا،

ر، ۲۰ رے سات سین ... ش: ہمارے ساتھ سے ... ٹ م ن: ہم اس کو جانتے تھے مشفق اپنا مہرباں اپنا،

ٹ ت: کوں] (۲۰۳) م ش،

(۳) لکھو جا باغباں سے نصیحت رہ کے گلستاں اپنا | چلے ہم آتشِ گل سے جلا کر خانماں اپنا

(۴) نہ گل اپنا کیا میں نے نہ بلبل باغباں اپنا | چمن میں کس بھروسے باندھا ہے آشیاں اپنا

(۵) یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سوں زندگی کرتے | اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

(۶) جنوں سوں اس قدر دُنیں کہ رسوا ہو گئیں آخر | ڈبایا ہائے ان آنکھوں نیں آخر خانماں اپنا

(۷) قفس کے بیچ کیا حسرت ستی بلبل یہ کہتی ہے | کہ پھر بھی دیکھنا قسمت، ہوے گا بوستاں اپنا

(۸) یہ بلبل بے اجازت باغباں کے گل نہیں لیتی ہے | مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جی دے گی نداں اپنا

(۹) کہیں دیتے میں جی کے وصل ہوتا ہات لگتا ہے | دیا برباد پروانے نیں ناحق دودماں اپنا

(۱۰) مرا جلتا ہے دل اس بلبلِ بے کس کی غربت پر | کہ گل کے آسرے پر جن نے چھوڑا آشیاں اپنا

---

(۵) گ، ت، ر، طا، چ، خ، ش، م، ف، گ، س، م، ن، ع، ام، ن، ع، ام، ش، م، ک، ب، ض، م : دل، ت، ر
کس کس مزے سوں،

ر، م، ف، ع، م، ش، م، ک، ب، ض، کس کس مزے سے | ش، گ، س، م، ن، ا، کیا کیا مزے سے
ا۔ ح : کن کن مزوں سے | م، ر : کیا کیا مزے کی،

ت، اگر ہوتا گل اپنا، گلچیں اپنا باغباں اپنا | م، ش : اگر ہوتا گل اپنا گلشن اپنا......

(۶) ت، ا، م، ش، م، ک، ب، ض [ا، م، ک، ب، ض، ا، م، ے، یاں، کہ، ر، دئیں ....]

ا : ڈبایا ہائے آنکھوں نے غرہ کا خانداں اپنا | م، ک، ب، ض : نے

ت

(۸) ت، گ، س [گ، س : سے | گ، س : نداں]

(۹) ت، م، ک، ر، ض [م، ک، ب، ض کہیں دینے سے جی کے وصل خوباں بات آتا ہے م، ک، ب، ض، نے

(۱۰) گ، ت، ر، چ، ح، س، گ، س، ا، م، ک، ب، ض [ا، مرا جی جلتا ہے ..... ر، ح، ش، گ، س :
جی م، ک، ب، ض کہ گل کے آسرے میں جس نے باندھا آشیاں اپنا،

(۱۱) رقیباں[1] کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

(۱۲) نکالا باغ سے صیاد نے یوں ہم کو یا قسمت!
لکھا یوں تھا کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

(۱۳) جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن[1] سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا

(۱۴) کوئی آزردہ[2] کرتا ہے سجن ایسے[3] کو ہے ظالم[4]
یہ دولت[5] خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاں اپنا

---

(۱۵) بہار آنے سے[6] بلبل نے بگاڑا ہے مزاج اپنا
سمائی تنہیں ہے پھولوں میں گریبانی ہر راج اپنا

(۱۶) بہار آئی، کھل آئے باغ، بلبل پھول کر بیٹھی
دوانوں کو کہو اس وقت کرلیویں علاج اپنا

---

(۱۱) م، ط، م ک، ب ض، م ر [لے م ک، ب ض: نہ کچھ تقصیر ثابت ہے رقیبوں کی نہ خوابوں کی
ط: نہ کچھ تقصیر اب ثابت ہے اس دل کی نہ خوباں کی]

(۱۲) ط

(۱۳) ا

(۱۴) گ، ت، م ر یج، ط، ح، ش، م ف، گ س، م ن، ع، ا، م ش، م ک، ب ض، م ر
[۲ے م ر: کوئی آزار کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم!
ط، ح، م ر: کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم! ع: کوئی آزردہ کرتا ہے صنم اپنے کو ہے ظالم!
م ش: سجن آزردہ کرتا ہے کوئی ایسے کو اے ظالم ۳ے ت: کوں ۴ے ر: اے
۵ے ت: جو

(۱۵ تا ۱۷)، ۶ے لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ (چمنستان شعرا) میں میرزا صاحب کے چند اشعار اپنی پسند کے لکھنے کے بعد بہت سے اشعار نکات الشعرا (میر تقی میر) اور تذکرۂ ریختہ گویاں (فتح علی گردیزی) سے نقل کئے ہیں، ان اشعار کے نقل کرنے سے پہلے وہ لکھتے ہیں کہ:

این چند اشعار آبدار فتح علی خان و میر تقی میر می نویسند: (چمنستان شعرا ص ۲۵۰)

یہ اشعار بھی اسی عبارت کے تحت نقل ہوئے ہیں، لیکن یہ نہ نکات الشعرا میں پائے جاتے ہیں اور نہ تذکرۂ ریختہ گویاں میں، کسی اور تذکرہ یا کتاب میں بھی یہ اشعار ہماری نظر سے نہیں گذرے،

(۱۷) گلوں کے فرش پر مت بیٹھ یوں نڈرے کو بھلا بلبل — خزاں کے آونے کی ہے خبر رکھ سر سے تاج اپنا

---

(۱۸) سحر اس حسن کے خورشید کوں جا کر جگا دیکھا — ظہورِ حق کوں دیکھا، خوب دیکھا، با صفا دیکھا

(۱۹) نہیں پایا مرے رونے کوں اور فریاد کو بادل — برس دیکھا، جھڑی کوں باند دیکھا، کڑکڑا دیکھا

(۲۰) سجن کس کس مزہ سے آج دیکھا ہم طرف یار و — اشارہ کر کے دیکھا، ہنس کے دیکھا، مسکرا دیکھا

(۲۱) ہمارے دل کوں کس کس ظلم سوں دیکھا او ظالم نے — نظر میں جہاں دیکھا، داغ کر دیکھا، جلا دیکھا

(۲۲) سجن کوں اپنے رنگیں اچھیلوں خوبی کی فوجوں میں — نپٹ بے باک دیکھا، رند دیکھا، من چلا دیکھا

(۲۳) جو اٹھ کر نیند سے تیری طرف دیکھا او سارا دن — تماچہ قہر کا دیکھا، غضب دیکھا، بلا دیکھا

(۲۴) ہوا ہوں بند اس کے غم میں اوس دن سوں؟ — کہ وہ مجکوں نظر بھر بھر کے دیکھا، دل جلا دیکھا

(۲۵) میں دیکھا رات اوس کی زلف کے پیچوں کے بندوں کوں — سحر زنجیر دیکھا، دام دیکھا، اژدہا دیکھا

(۲۶) کبھی ملتا نہیں میرا ہٹیلا کیا کروں مظہر — تصدق ہو کے دیکھا، پاؤں پڑ دیکھا، منا دیکھا

---

(۲۷) گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

(۲۸) لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس! — کیا ہوا اس کے تئیں اتنا تو بیمار نہ تھا

(۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲) ک ن، م ش [سلہ م ش: منجھ ـ سٹہ م ش: اشارت ـ سٹہ م ش: کیا کیا ظلم سے ـ شہ م ش: سجن اپنے کوں سارے اچھیلے خوباں کی فوجوں میں]

(۲۳، ۲۴) ک ل [شہ مصرع میں سکتہ ہے، ایک رکن کم ہے،]

(۲۵، ۲۶) ک ل، م ش [ہہ م ش: نہیں ملتا مرا نازک ہٹیلا کیا کروں مظہر]

(۲۷) گ، گ س، گ ا، ت ع، م ن، ع، ع م، س ا [شہ م ن، ع، ع م، س ا، لیکن اس]

(۲۸) ح، ت ہ، م ن، م ا، ع، گ ب، خ، گ ہ، ک، س، ط، ا [شہ م ن، گ ب، گ ہ، س ا: کیا ہوا اس کو وہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا ط: کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی تو بیمار نہ تھا]

(۲۹) زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا
صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

---

(۳۰) نہیں کچھ غم کہ کیوں[۱] ملتا نہیں پیماں گسل میرا[۲]
میں[۳] روتا ہوں یہ دل کی بے کسی پر ہائے دل میرا

---

(۳۱) سویا پڑا ہے کیا رے نازک بدن اکیلا
کس بیر کا وہ سویا جامہ اسے اٹھا لا

---

(۳۲) جب گانٹھ کھولے زلف کی تب کیا وہ بیگانہ ہوا
تیری گرہ کا کیا گیا میں سب سیں بیگانہ ہوا

---

(۳۳) وقت ہے ماہ رو کے آنے کا
فکر کر شمع کے بجھانے کا

---

(۳۴) کیوں کماں ابرو اوپر قربان ہوا
چلہ کش کو کیا مگر گوشہ نہ تھا

---

(۳۵) ملاحت ہے ترے اس حسن میں جاوید روز افزوں
اگر غفلت کی خو جاوے تو جو (؟) عاشق کا

---

(۲۹) گ، ر، چ، ش، گ س،

(۳۰) گ، ر، چ، گ س، گ، ا، ت ع، ط، س، ا[۱ گ، ا، یوں

[۲] ر: نہیں کچھ غم کہ دل ملتا نہیں پیماں گسل میرا

[۳] ر، ت ع، ط، س: کہ میں روتا ہوں دل..... چ، گ س: میں روتا ہوں گا دل.....

(۳۱ تا ۳۵) ب

(۳۶) خوب لکھتا ہے سب جواہر ہیں — زور موتے ہے بے بہا لڑکا

---

(۳۷) چلی [۱] بیٹی دکن دخت ظفر خاں — مگر قسمت میں آب نربدا تھا

---

(۳۸) جب چلا توں نہ چلا کچھ ترے داماں پہ زور — ہات ناچار مکدر ہو گریباں کو چلا

---

(۳۹) جواں مارا گیا خوبوں [۲] کے اوپر میرزا مظہر — بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ [۳] تھا خوب کام آیا [۴]

(ت)

(۴۰) رات کو عیش رہا تھا گل رخسار کے سات — جیسے بلبل خوشی رہتی ہے گلزار کے سات

(۴۱) زلف کوں ہات لگاتے ہی پکارا دل نے — جی چلا پینچ میں اس زلف گرہ گیر کے سات

(۴۲) دل بہا اس طرح سے اور ہو یا رو — جان جاتا ہے جدا اشک کی مہکار کے سات

(۴۳) گرچہ اسلوب نہ ہو سکے تو کچھ انصاف کرو — زندگی کیوں کہ کٹے ایسے ستمگار کے سات

(۴۴) ایک دم تھا سو بھی نہ رہا آیا اک میں مظہر — جی گیا، جان گیا، دم بھی چلا یار کے سات

(۳۵ تا ۳۷) ب: [۱] اس شعر کے مقابل میں بیاض میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "در ہجو دخت ظفر خاں کہ بناہر جنگ پسر آصف منسوب شدہ بدکن رفت"۔

(۳۸) ر

(۳۹) ن، ک، ر، ج، ط، ح، م ن، ع، ا، ب، س، ا ب ج [۲] گ، ط، ح، ع: خوباں م ن ا ب ج: خوباں کے بدلے ر: خوبوں کی خاطر [۳] ع: تھا کچھ [۴] ا ب ج:

بھلا تھا یا برا تھا جس طرح تھا خوب کام آیا

(۴۰ تا ۴۴) ک ل

(د)

(۴۵) کیا مزہ کا خال ہے تجھ مکھ پہ میرے اعتقاد
خوب ہے آنکھاں کے بادامو سے اس تل کا سواد

(ر)

(۴۶) ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں! کیا مفت جاتی ہے بہار

(۴۷) لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

(۴۸) نرگس و گل کی دکھو کلیاں کھلی جاتی ہیں سب
پھر ان خوابیدہ مستوں کو جگاتی ہے بہار

(۴۹) ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سیتی
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

(۵۰) شاخ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

---

(۵۱) لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

---

(۴۵) د

(۴۶) ن، گ، م، ر، پ، ط، ح، ش، گ س، گ ا، ت ع، م ن، گ ب، ع، ع م، گ ہ، ک س، ا، ا ب ض [لہ ک: میں سے گ ب، گ ہ، ع، ع م، ک، س، ا: لبس
سہ ح، ت ع: چاد اسے گ س، گ ب، گ ہ، ک، س: اور

(۴۷) گ، م، ر، پ، ش، گ س، م ن، ع، ا ب ض

(۴۸) گ، ر، پ، ح، ش، گ س، ا ب ض [شہ گ س: نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
سہ پ: فتنے ش، گ س: فتنوں]

(۴۹) گ، پ، ش، م ف، گ ا، ا ب ض [شہ م ف: سے]

(۵۰) ر، پ، م ن، ا، ا ب ض [شہ م ن: کوں سہ پ: اشارت

(۵۱) م ن

(۵۲) ہم سے نازک بدن ہوا باغی — کیوں نہ ملنے کو اب لگا دے بیر

---

(۵۳) یار میرے کے گھر میں ہے بیری — دن میں دیتا ہے مجکو سو سو بیر

(ق)

(۵۴) جہاں آباد ان دونوں کے ہے بیچ — ادھر جمنا، ادھر رمنا ہے تحقیق

(ل)

(۵۵) اب کوئی ساعت میں آ صیاد کرتا ہے ملول — ایک دم کوں بلبلو کیوں بیٹھتی ہو بھول پھول

(م)

(۵۶) اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں[1] اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم[2]

(۵۲، ۵۳) ب

(۵۴ و ۵۵) ب

(۵۶) گ، ا، ر، ج، ش، م، ث [۱؎ ج: ہو ویں]

۲؎ گلزار ابراہیم اور تذکرہ میر حسن میں یہ شعر عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی طرف منسوب ہے۔ گلزار ابراہیم میں پہلا مصرع یوں درج ہے: ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم، میر حسن نے یوں نقل کیا ہے: ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم، اگرچہ اس زمین میں انجام کی پوری غزل موجود ہے پھر بھی ہم اس شعر کو میرزا صاحب کے اشعار میں رکھتے ہیں، کیونکہ گردیزی، ذوق، شفیق، شورش اور ابوالحسن، میر حسن، علی ابراہیم پر مقدم ہیں۔

(ن)

(۵۷) گل کو جو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں | دُر کو جو دُر کہوں تو اس آنسو کو کیا کہوں
(۵۸) مجھ پر ہوا ہے تنگ سجن عرصۂ سخن | بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں
(۵۹) مدت سے اس خیال کے آیا ہوں پیچ میں | گر مو کہوں کمر کو تو گیسو کو کیا کہوں
(۶۰) رونے سے تجھ فراق کے آنکھیں مری گئیں | ڈوبا یہ خاندان اس آنسو کو کیا کہوں
(۶۱) دیوانہ کر لیا ہے مری جان و تن کتیں | مالی تری بہار کے جادو کو کیا کہوں
(۶۲) کرتا ہے جور جو عوض اپنے ہی یار کے | مظہر ترے ستم گر بد خو کو کیا کہوں

---

(۶۳) رشتۂ جاں ہی اگر ہو ترا تار دامن | آہ! اس پر بھی سمجھتا ہے تو بارِ دامن
(۶۴) دیکھ کر گل نے کہا تجھ پہ نزاکت ہے ختم | کس ادا ساتھ لچکتا ہے یہ بارِ دامن

(۵۷ تا ۶۲) م ک، ب ض [ل ن، گ، ر، ج، ا، ش اور ع م میں صرف یہ شعر ملتا ہے:

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں | بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

لیکن م ک اور ب ض میں یہ مکمل غزل موجود ہے۔]

طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوق) میں مندرجۂ ذیل چار شعر اس ترتیب کے ساتھ درج ہیں۔

۱۔ گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں | بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں
۲۔ مدت سے اس خیال کے آیا ہوں پیچ میں | گر مو کہوں کمر کو تو گیسو کو کیا کہوں
۳۔ مجھ پر ہوا ہے تنگ سجن عرصۂ سخن | گر دُر کو دُر کہوں تو اس آنسو کو کیا کہوں
۴۔ دیوانہ کر لیا ہے مری جان و دل کے تئیں | مظہر ترے ستمگر بد خو کو کیا کہوں

(۶۳ و ۶۴) ب ا

(۶۵) کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نیں بیڑۂ پاں کوں

---

(۶۶) توفیق دے کہ شور سے اک دم تو چپ رہے
آخر یہ میرا یہ دل ہے الٰہی جرس نہیں

---

(۶۷) حسن تیرا مثالِ دریا ہے
کیوں نہیں کل لگا لیوں مچھیاں

---

(۶۸) جان میرا گیا ہے کرکے بیچ
جان نکلے تلک میں بیٹھا ہوں

---

(۶۹) سب گلوں میں وہ شوخ دلبر کوں
خوب لگتا ہے باغ میں کرناں

---

(۷۰) سنگ دل یار رزم تکئے سا
دیکھئے جی چاہے ٹک لگا بیٹھوں

---

(۷۱) اس کے دل میں کبھی تاثیر نہ کی
اے محبت اسے کیا کہتے ہیں

---

(۶۵) ن، گ، م، ر، پ، ط، ع، م ر [؎۱ گ، م، پ، م، نے ؎۲ گ، م، ر، پ، ع، م ر: کو]

(۶۶) گ، ر، پ، ح، م، ن، ع، ط، س، ا [؎۳ ط، س: وہ
؎۴ ر، ع: آخر یہ میرا دل ہے ....

(۶۷ تا ۷۰) ب

(۷۱) یہ شعر ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب اردو غزل میں میرزا صاحب کے دوسرے اشعار کے ساتھ نقل کیا ہے۔ معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے۔

(و)

(۲) آتش کہو شرارہ کہو کوئلا کہو ۔۔۔ مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

---

(۳) آج مت رنگ حنا سے کف پالال کرو ۔۔۔ اے بتاں، اس دل پر خون کو پامال کرو

---

(۴) اب رقیب اس بزم میں جا کر ہوا پیر مغاں ۔۔۔ جائے تعظیم است اے یارو اسے گرجی کہو

(ہ)

(۵) اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ ۔۔۔ اس واسطے پڑا ہوں چمن میں ہوا کے ہاتھ

(۶) مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر ۔۔۔ سورج کے ہاتھ چوتری و پنکھا صبا کے ہاتھ

(۷) آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سیں ۔۔۔ مینا لگا ہے جب سیتی مجھ بے نوا کے ہاتھ

---

(۲) ن، گ، م، ر، پ، ط، ح، ع، م ر [سلہ ط، ح: شرار سلہ گ، م، ر، چ، ط، ح، ع، م ر: کو]

(۳) ح، م ن

(۴) ب

(۵) گ گ، ت، پ، م ف، ت ہ، م ا، ع، ع م، خ م ش، ب ض [سلہ ت: کون
سلہ ت، پ، ع، ع م، م ش، ب ض: ہات سلہ ت، ت ہ، م ف، ع، ع م، خ م ش، ب ض بکا
چ: لگا سلہ ت، پ، ت ہ، م ف، م ا، ع، ع م، خ م ش، ب ض: کی

(۶) ن، گ گ، ت، گ، م، پ، ط، ح، ش، م ف، گ ا، ت ہ، م ا، ع، ع م، ب ض:
سلہ گ گ، ت، م ف، ت ہ، م ا، ع، ب ض: جلتا
گ ا: مرتا ہوں میرزائی گل پر میں ہر سحر سلہ گ گ، ت، م، م ا، ع، م، ب ض، چوری
سلہ ش، م ف، ع م: سورج کے ہاتھ چوری ہے پنکھا صبا کے ہاتھ]

(۷) گ گ، ت، پ، ب ض [سلہ ت: سوں ب ض: سے

(۷۸) برگ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا — شاید کبھو تو جا کے لگے دل ربا کے ہاتھ
(۷۹) مظہر چھپا کے رکھ دل نازک انپس کا توں — یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

---

(۸۰) پھولے ہیں گل چمن میں صنم کا جمال دیکھ — لالہ بدل ہے داغ ترے مکھ کا خال دیکھ
(۸۱) بلبل فدا ہوئی ہے ترے رخ پر اے صنم — سنبل ہے پیچ پیچ تری زلف و بال دیکھ

---

(۸۲) کیا جواں مارا گیا خوباں کے ہاتھ — لاکھ حسرت کھیت آئیں جس کے ہاتھ

---

(۷۸) گ گ، ت، گ ا، ت ہ، م ا، ع، ع م، خ، ب ض

[ل ع برگ حنا پہ کیجو رقم حال دل مرا — شاید کہ جا لگے وہ کسی دل ربا کے ہاتھ

خ: برگ حنا پہ یار و مرا حال دل لکھو — شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ

ت ہ: شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ — ع م: شاید کہ جا لگے وہ کسی دل ربا کے ہاتھ

ب ض: کبھو ہے میر گردیزی، قائم اور حسن نے یہ شعر یک رنگ سے منسوب کیا ہے، چاروں تذکروں میں پہلا مصرع اسی طرح ہے، دوسرے مصرع میں خفیف سا لفظی تغیر ہے، شفیق نے بھی یہ شعر یک رنگ کے اشعار میں نقل کیا ہے، لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ "اگرچہ ایں بیت کہ گذشت میر تقی میر بنام یک رنگ نوشتہ است اما بنام میرزا مظہر شہرۂ عوام دارد، واللہ اعلم" (چمنستان شعرا ص ۲۲۵)

(۷۹) گ گ، ت، م، پ، ط، گ ا، ط، ک، س، م ش، ب ض، م ر [ت ہ، پ، گ ا: کے تئیں مرے
ط: کے تئیں م، ط، ک، س، م ر: کو اپنے تو م ش، ب ض: کتیں مرے

(۸۰ و ۸۱) پ

(۸۲) ط

(۸۳) سرمہ آلودہ سفید و سرخ اور مژگاں سیاہ — کیوں نہ مارے اس طرح چورنگ شمشیر نگاہ

---

(۸۴) خجلت سے تجھ نگہ کی مے ہوگئی ہے پانی — کتنا بجا ہوا ہے شیشہ کو آبگینہ

(ی)

(۸۵) تجلی گر تری پست و بلنداں کو نہ دکھلاتی — فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی

(۸۶) حنا تیرے کف پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی — یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی

(۸۷) اگر یہ سرد مہری تجھکو آسائش نہ سکھلاتی — تو کیونکر آفتاب حسن کی گرمی میں نیند آتی

(۸۸) الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا — محبت گر ہماری چشم تر سے منہ[1] نہ برساتی

---

(۸۹) جھکی ہو فوج گل اور عندلیباں کی پکار آئی — ارے ہنستا ہے کیا وہ دیکھ دیوانے بہار آئی

(۹۰) نہ جانوں صبح دم باد صبا کیا جا پکار آئی — کہ غنچے کا دل نازک چمن کے بیچ پھاڑ آئی

(۹۱) کیا بلبل نے نعرہ آہ قمری نے روئی شبنم — خدایا باغ میں آئی قیامت یا بہار آئی

---

(۸۳) ب

(۸۴) ر

(۸۵) گ، ر، ج، ش

(۸۶) گ، ر، ج، گ س،

(۸۷) گ، ر، ج، م ف، ش

(۸۸) گ، ر، ج [[1] میرزا صاحب کے زمانہ میں یہی تلفظ صحیح تھا۔ (ملاحظہ ہو دریائے لطافت، اردو ترجمہ از پنڈت کیفی ص ۳۶)]

(۸۹ تا ۹۱) ر

(۹۲) کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی
یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی

(۹۳) خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

---

(۹۴) قاتل کو دیکھ بھیڑ گلی کی سمٹ گئی
یہ راہ چھاتیوں کے کواڑوں سے پٹ گئی

---

(۹۵) اودھر نگہ کی تیغ ادھر آہ کی سناں
اس کشمکش میں عمر ہماری بھی کٹ گئی

---

(۹۶) کہنوا ہیر کے سیں تجکو گیو دہائی
کب لگ رہے گا پچھڑا تک مل مرے کسائی

---

(۹۷) زلفوں کا جال رو دیے بیٹھا ہے وہ شکر لب
اے دل مگس ہو مت جا وہ شوخ ہے گا مکڑی

---

(۹۸) چلے کیا زور چشموں کا کہو دریا سے شور اکے
نہ دی ناؤں نے مجھ آنکھوں کو فرصت کھل کے رونے کی

---

(۹۲) پ، ع [لہ ع: کبھو]

(۹۳) گ، پ، ع

(۹۴) م، ع

(۹۵) م

(۹۶) ب

(۹۷، ۹۸) ب

(۹۹) سیو اے گر لب شیریں مجھے خوش نہیں شکر بارے
حلاوت فہم دل کھاتا ہے میٹھے جگ کے سب کھارے

(۱۰۰) اُوگل رو نے لگایا عنبریں زلفوں کے (دو؟)
گلستان دل کے چشموں میں گل شبو کے فوارے

(۱۰۱) بوجھایا دلبر جانی نے آکر ابر رحمت سے
رقیبوں نے نپٹ دھو کا دئے ہیں غم کے انگارے

(۱۰۲) طبیب اچھے جا ترجانے نہیں علاج (اب) ہو چکا میرا
جہاں میں کوئی جیتا ہے دیوانہ زلف کے مارے

(۱۰۳) رسد پہونچا او شاہ حسن کو جلدی سے جاں ہو گئے
لے مانڈا اشک کا اے دل توں سو کے بنجارے

(۱۰۴) خدا جانے دیوانہ دل کدھر جاتا رہو گا (؟)
صبح سے شام تگ آہوں کے دوڑاتا ہوں ہرکارے

(۱۰۵) شب اوس مہتاب رو کی بزم میں منظر عرق افشاں
کلیجا پھٹ گیا مہتاب کا گرنے لگیں تارے

---

(۱۰۶) یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں ہم کو دماغ و دل رہا ہے

---

(۹۹) ک، ل، ب ض [ب ض: سوائے دو]
(۱۰۰) ک ل، ب ض [ب ض: وہ ب ض: دبچوں میں]
(۱۰۱) ک ل
(۱۰۲) ک ل، ب ض [ب ض: سے ب ض: جہاں میں کس بھی جیتے ہیں دوانے عشق کے مارے]
(۱۰۳) ک ل، ب ض [ب ض: رسد پہنچا دے شاہ حسن جلدی سے جاں ہو وے]
توں لے کر عشق کا تانڈا اے دل سودائی بنجارے
(۱۰۴) ک ل
(۱۰۵) ک ل، ب ض [ب ض: جبین ب ض: لگے]
(۱۰۶) گ، م، ر، ج، ش، م ف، گ س، ط س، ت ہ، م ا، م ن، ع، ع م، خ، ا، ب
[م ن: نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے — نہ مجکو وہ دماغ و دل رہا ہے

صاحب گل رعنا نے شعر ۱۰۵ اور اس شعر کو دو مختلف اشعار قرار دے کر دونوں کو میرزا صاحب کے اشعار کے تحت نقل کیا ہے،

میر گردیزی اور شفیق نے اس شعر کو مصطفےٰ خاں یک رنگ سے منسوب کیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ان کے دو مختلف اشعار ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا لیکن دوسرا شعر میرزا صاحب کا نہیں کہلائے گا، یک رنگ میرزا صاحب کے ہم عصر تھے اس لئے اس قسم کے توارد کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں،

م، ش، م ف، گ س، ط س، ت ہ، م ا، ع، ع م، خ، ا، ب؛ اس ر، ش، م ف، ط س، ت ہ، م ا، خ؛ اور

(۱۰۷) نہیں[1] آتا کسی تکیے اوپر[2] خواب — یہ سر[3] پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

(۱۰۸) خدا کے واسطے اُس[4] کو نہ[5] ٹوکو[6] — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

(۱۰۹) گذر گئے[7] دین اور دنیا سے تس پر — ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے

(۱۱۰) غنیمت جان قاتل جانِ مظہرؔ — یہ مقتولوں میں تک بسمل رہا ہے

---

(۱۱۱) خبر کو یار کی دل کو میں بھیجا ہو کہ جا لاوے — نہیں معلوم ہوتا ہے اسے کب تک خدا لاوے

(۱۱۲) عزیزاں ایک لحمہ میں مرا جی اب نکلتا ہو — طبیب عشق کو کوئی شتابی سے بلا لاوے

(۱۱۳) موا مظہر پڑا ہے یار کے کوچے میں کئی دن سے — خدا کے واسطے اس کو کوئی جا کر اٹھا لاوے

---

(۱۱۴) اگر ملئے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے — غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

---

(۱۰۷) گ، م، ر، پ، ش، م ف، گ س، ط س، م ن، ع، ا، ب [۱ م: نہ آوے بالش مخمل اوپر خواب

ش: نہیں ملتا کسی تکیہ سے آرام م ف: نہیں مخمل کے تکئے پر مجھے چین گ س: نہیں آتا اسے تکئے اوپر خواب

ا: نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام ط س: نہیں لیتا کسی تکیہ پہ آرام ب: کسی تکئے اوپر آتی نہیں نیند

[2] پ: ادپر [3] ب: یہ سر قدموں میں ان کے ہل رہا ہے]

(۱۰۸) گ، ن، م، ر، پ، ط، ح، ش، گ س، گ ا، ط س، ت ہ، م ن، ت ع، ع، ع م، گ ب، خ ک، ط، گ ہ،

س ا، ب، م ر، [[4] گ ا: ان ب: کوئی دیجائے اس کو [5] ن: کوں [6] م ن: چھیڑو [7] ب: جہاں میں اک یہی قاتل رہا ہے]

(۱۰۹، ۱۱۰) ح، ر، ط س، [[8] ط س: دل و دیں سے تو گذرے اب ترا گھر — نہیں معلوم کے منزل رہا ہے

[9] ط س: مقطع اس طرح ہے: نہ اٹھا گھر سے مظہر کا نہ جائے — کوئی ملنے کے کب قابل رہا ہے]

(۱۱۱ تا ۱۱۳) م ف

(۱۱۴) م ن، ع، ع م، گ ہ، س، ا [[10] س: نہ ملئے گر [11] ع م، س، گ ہ: مزاجوں

(۱۱۵) کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی — کسی کا یا رب عاشق کہیں ہو کیا قیامت ہے

---

(۱۱۶) رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے — ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

---

(۱۱۷) الٰہی مت کسو[۱] کو پیش رنج[۲] و انتظار آوے — ہمارا[۳] دیکھیے کیا حال ہو جب تک[۴] بہار آوے[۵]

---

(۱۱۸) کیوں[۱] (.....) زاہد سبحہ کا تو نام لے — وہ صنم کب رام ہوتا ہے خدا کا نام لے[۲]

---

(۱۱۹) خداوندا اٹھا لے ہجر کے درمیان سوں پردے — ہمیں صیاد کے اب دام میں ڈالا، ہمیں پر دے

---

(۱۱۵) م ن

(۱۱۶) گ ا [۱ے تذکرۂ میر حسن میں یہ شعر آفتاب رائے سے منسوب ہے]

(۱۱۷) گ، ر، پ، ش، م ف، گ س [۱ے ش، م ف: کسی ۲ے ش، م ف، گ س: رنج انتظار
۳ے ش: ہماری دیکھیے حالت ہو کیا جب تک بہار آوے ۴ے گ س: کہ یار
۵ے مخزن نکات میں یہ شعر محمد فقیہ دردمند سے منسوب ہے، تذکرۂ میر حسن اور گلزار ابراہیم میں غریب دہلوی سے منسوب ہے، دونوں تذکروں میں پہلا مصرع یوں نقل ہوا ہے،
الٰہی مت کسی کے پیش درد انتظار آوے۔ دوسرا مصرع تذکرۂ میر حسن میں اسی طرح ہے،
گلزار ابراہیم میں بہار آوے کے بجائے کہ یار آوے درج ہے۔]

(۱۱۸) پ، ب، [۱ے ب: شیخ کیوں جاتا ہے واں تسبیح کا تو دام لے ۲ے مخزن نکات میں یہ شعر میر سعادت علی کی طرف منسوب ہے، پہلا مصرع یوں نقل ہوا ہے:
شیخ تو جاتا ہے کیوں تسبیح کا واں دام لے]

(۱۱۹) ت [۱ے چمنستان شعرا میں یہ شعر آبرو سے منسوب ہے، شعر یوں نقل ہوا ہے:
خداوندا اٹھا دے درمیاں سے ہجر کے پردے — میرے صیاد کو لا دام میں تو یا مجھے پر دے۔]

(۱۲۰) برچھی کو پکڑ ہاتھ میں آتے ہو اکیلے — کیا راج بہادر ہو سجن روپ نگر کے

---

(۱۲۱) رات کوں آکر بسا مجھ بر نہیں وہ گلبدن — ماہ جس کے باغ میں یک چاندنی کا پھول ہے

---

(۱۲۲) علی کے ناؤں کی تسبیح ورد کر منگا — ہزار شکر کہ دانا امام پایا ہے

---

(۱۲۳) ہم سیں کمان ابرو میداں پکڑ گیا ہو — قبضے میں تب وہ آوے گوش میں کھینچو چلے

---

(۱۲۴) گندمی رنگ اگر نہ ہوئے پیدا — حسن کا ان دنوں میں کال پڑے

---

(۱۲۵) کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بولو
کہ آخر ایک ہیں آپس میں دونوں بیچ رشتا ہے

---

(۱۲۰) ب

(۱۲۱، ۱۲۲) ت

(۱۲۳) ب

(۱۲۴) ب، ب ج [۱؎ ب ج: گندمی رنگ گر نہ ہو پیدا حسن کا جگ کے بیچ کال پڑے]

(۱۲۵) ب، ب ج [۲؎ ب ج: یہ دونوں ایک ہیں آپس میں دونوں بیچ رشتا ہے۔

۳؎ چمنستان شعرا میں یہ شعر شاہ مبارک آبرو کی طرف منسوب ہے۔ دوسرا مصرع یوں نقل ہوا ہے:
یہ دونوں ایک ہیں آپس میں ان کے بیچ رشتہ ہے]

کتابیات

آرزو (سراج الدین علی خاں)، مجمع النفائس (قلمی)، اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنا

آزاد (مولانا محمد حسین): آب حیات، طبع دوازدہم، شیخ مبارک علی ۔ لاہور

آزاد بلگرامی (میر غلام علی)، خزانۂ عامرہ، مطبع نول کشور کان پور ۱۸۷۱ء

سرو آزاد کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد ۱۹۱۳ء

ماثر الکرام، " " " ۱۹۱۰ء

ابوالحسن امیر احمد: تذکرۂ مسرت افزا (بحوالۂ معاصر، پٹنا، جلد ۲ حصہ ،)

ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر): مصحفی اور ان کا کلام، شیخ مبارک علی، لاہور

احمد علی سندیلوی: مخزن الغرائب (قلمی) دارالمصنفین، اعظم گڈھ ،

اروِن (ولیم): لے ٹر مغلز، جلد اول، ام، اس، سی، سرکار اینڈ سنز، کلکتا، ۱۹۲۲ء

اسٹریچی (سر جان)، ہیز ٹنگز اور روہیلہ جنگ، آکسفورڈ، ۱۸۹۲ء

اشرف علی خاں (میر)، تذکرۃ الشعرا (قلمی) رضا لائبریری رام پور

افضل بیگ قاقشال؛ تحفۃ الشعرا (قلمی) کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد

اکرام (شیخ محمد): رود کوثر، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۸ء

بھگوان داس ہندی: سفینۂ ہندی (قلمی) اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنا

بیان (تھامس ولیم): اورنٹیل بایوگرافیکل ڈکشنری، ایلن اینڈ کمپنی، لندن، ۱۸۹۴ء

تاباں (عبدالحئی): دیوان تاباں، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۵ء

چاند (شیخ): سودا، " " ۱۹۳۶ء

حاکم لاہوری: مردم دیدہ

حزیں، شیخ علی، سفینۂ شیخ علی حزیں مرتبہ مسعود علی دارالطبع جامع عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۳۰ء

حسن (میر): تذکرۂ شعرائے اردو، انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۴۰ء

حسین دوست سنبھلی: تذکرۂ حسینی، نول کشور پریس، لکھنؤ

حمید اورنگ آبادی: گلشن گفتار، مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد ۱۳۲۹ف

حیرت اکبرآبادی (قیام الدین): مقالات الشعرا (قلمی) رضا لائبریری رام پور

خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

خوشگو (بندرابن): سفینۂ خوشگو (قلمی) اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنا

درد (خواجہ) دیوان درد، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۹ء

درگاہ قلی خان: مرقع دہلی، (قلمی) کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد

ذکا (خوب چند) عیار الشعرا (قلمی) مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو، علی گڑھ

رام بابو سکسینہ: مرقع شعرا، دھومی مل دھرم داس، دہلی، ۱۹۵۶ء

زور (ڈاکٹر سید محی الدین قادری): سرگذشت حاتم، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۱۹۴۴ء

" فہرست مخطوطات اردو کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، جلد اول،

ہندوستانی لسانیات، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۴۳ء

سرسید احمد خاں؛ تذکرۂ اہل دہلی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۵۵

سرکار (جدوناتھ)؛ زوال سلطنت مغلیہ (انگریزی) جلد اول ام۔ سی سرکار اینڈ سنز کلکتہ ۱۹۳۲ء

" " " دوم " " " ۱۹۳۴ء

" " " سوم ایس۔ ان سرکار " ۱۹۳۸ء

سرور (محمد)؛ عمدۂ منتخبہ (قلمی) انڈیا آفس لائبریری، لندن

شاہنواز خاں، نواب صمصام الدولہ، مرتبہ مولوی عبدالرحیم

مآثر الامرا، جلد اول، ایشیاٹک سوسائٹی، آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۸۸ء

مرتبہ مولوی میرزا اشرف علی، جلد سوم، ایشیاٹک سوسائٹی، آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۹۱ء

سودا (میرزا رفیع)؛ کلیات سودا، نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۹۳۲ء

شبلی (مولانا)؛ شعر العجم، جلد پنجم، معارف پریس، ۱۹۴۰ء

مقالات شبلی، جلد سوم، دار المصنفین، اعظم گڈھ، ۱۹۲۲ء

" پنجم " " ۱۹۳۶ء

شفیق (لچھمی نرائن)، چمنستان شعرا، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۲۸ء

شورش (غلام حسین)؛ تذکرۂ شورش (قلمی) اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

شوق (قدرت اللہ)؛ طبقات الشعرا (قلمی) کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد

تکملۃ الشعرا (قلمی) رضا لائبریری، رام پور

شیفتہ (مصطفےٰ خاں)؛ گلشن بیخار، نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۸۷۴ء

عاشق الٰہی میرٹھی (محمد)؛ تذکرۃ الرشیدیہ، شمس المطابع و عزیز المطابع، میرٹھ

عباسی (محمود احمد)؛ تذکرۃ الکرام، جلد ثانی

عبد الحیٔ (مولانا): گل رعنا، دار المصنفین، اعظم گڈھ، ۱۳۶۴ھ

عبد السلام ندوی (مولانا): شعر الہند، جلد اول، دار المصنفین، اعظم گڈھ، ۱۹۳۳ء

عبد الغنی: تذکرۃ الشعرا، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ۱۹۱۶ء

عبد الوہاب دولت آبادی: تذکرۂ بے نظیر، کتابستان، الٰہ آباد

عشقی عظیم آبادی: تذکرۂ عشقی (قلمی) اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنا

علی ابراہیم: گلزار ابراہیم، انجمن ترقیٔ اردو ہند ۱۹۰۶ء

علی ہجویریؒ: کشف المحجوب، مطبع پنجابی لاہور، ۱۳۱۰ھ

غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

غلام سرور: خزینۃ الاصفیا، جلد اول، مطبع ثمر ہند، لکھنؤ، ۱۸۷۱ء

غلام علی (شاہ): مقامات مظہری، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ

فتوت (عنایت اللہ): ریاض حسنی (قلمی) کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

فرینکلن، شاہ عالم کی حکومت (انگریزی)، الٰہ آباد، ۱۹۳۴ء

قاسم (قدرت اللہ): مجموعۂ نغز، سلسلۂ نشریات کلیۂ پنجاب، لاہور، ۱۹۳۳ء

قدرت اللہ گوپاموی: نتائج الافکار، اردشیر خاضع، بمبئی، ۱۳۳۶ف

قائم چاند پوری: مخزن نکات، انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۲۹ء

کاظم (میرزا): گلشن سخن (قلمی) رضا لائبریری، رام پور

کریم الدین: طبقات شعرائے اردو، مطبع العلوم، دہلی، ۱۸۴۸ء

کمال (شاہ): مجموعۂ انتخاب (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد

کیفی (پنڈت برج موہن): دریائے لطافت (اردو ترجمہ) انجمن ترقیٔ اردو ہند، ۱۹۳۵ء

گارساں دتاسی: تاریخ ادبیات ہندوستانی (فرانسیسی) جلد دوم پیرس، ۱۸۷۰ء

گردیزی (فتح علی): تذکرۂ ریختہ گویاں، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۰۶ء

لطف (میرزا علی): گلشن ہند، " " ۱۹۰۶ء

مبتلا (میرٹھی)، طبقات سخن (بحوالہ ہماری زبان علی گڑھ، جلد ۱۹، شمارہ ۱۲)

مبین چریاکوٹی: جواہر سخن، جلد اول، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۳۲ء

مصحفی غلام ہمدانی: تذکرۂ ہندی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۳ء

عقد ثریا، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۴ء

مظہر (میرزا جان جاناں): دیوان مظہر (فارسی) مطبع مصطفائی، کان پور، ۱۲۷۲ھ

" شیخ الٰہی بخش، لاہور

کلمات طیبات، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ

رقعات کرامت سعات، میرزا مظہر شہید، مطبع فتح الاخبار، کول

۱۲۷۱ھ

مناظر احسن گیلانی: تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ نفیس اکیڈمی، حیدر آباد، ۱۹۴۶ء

میر (میر تقی): ذکر میر، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۵ء

کلیات میر: نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء

نکات الشعرا، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۵ء

ناصر (سعادت خاں): تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنا

نجم الغنی رام پوری: اخبار الصنادید، اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء

نساخ (عبد الغفور): سخن شعرا، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۱ھ

نصراللہ خاں خورجوی: گلشن ہمیشہ بہار، مطبع فتح الاخبار، کول، ۱۸۵۲ء

نعیم اللہ بہرائچی (مولوی): معمولات مظہریہ، مطبع نظامی، کانپور، ۱۲۷۵ھ

نورالحسن: طور کلیم، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۲۹۸ھ

نورالحسن ہاشمی: دلی کا دبستان شاعری، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۴۹ء

نیاز فتح پوری: انتقادیات، جلد دوم، عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد

یقین (انعام اللہ خاں): دیوان یقین، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۰ء

یکتا لکھنوی (احمد علی): دستور الفصاحت، ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۳ء

یوسف حسین خاں (ڈاکٹر): اردو غزل، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۵۲ء

اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۱۸، عدد ۱

بیاض احسن مارہروی (مسلم یونیورسٹی لائبریری، علی گڑھ

بیاض کتب خانہ جامع مسجد بمبئی،

بیاض نجیب اشرف ندوی (انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی،

بیاض نمبر ۱۲، کتب خانۂ سالار جنگ، حیدر آباد

" ۶۳۵ " " " "

تذکرۂ جمیع اولیای دہلی (قلمی) کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد

کشکول (قلمی) کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد

مجمع الاشعار (قلمی) " "

مجموعۂ کلام شعرائے قدیم (قلمی) " "

واقعۂ خرابیٔ دہلی (قلمی) کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد،

ہماری چند ادبی کتابیں

شعر الہند (حصہ اول) قدما کے دور سے لے کر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تمام تغیرات وانقلابات کی تفصیل، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ قیمت: ۱۸ روپے،

شعر الہند (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید، قیمت:- سترہ روپے،

اقبال کامل علامہ اقبال کے سوانح وحالات اور اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ اُن کی شاعری کے اہم موضوعات فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح، مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی، قیمت:- پندرہ روپے،

غالب مدح و قدح کی روشنی میں (حصہ اول) مرزا غالب کی زندگی سے ۱۹۲۸ء تک اُن کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر ناقدانہ تبصرہ، قیمت: اٹھارہ روپے،

غالب مدح و قدح کی روشنی میں (حصہ دوم) ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک مرزا غالب کی شاعری کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر ناقدانہ تبصرہ، قیمت: اٹھارہ روپے،

سلسلۂ **غالبیات** میں ایک پر از معلومات اور مفید کتاب کا اضافہ، اور غالب پر کام کرنے والوں کے لئے ایک مستند ماخذ،

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن